MAUL - 604

ایم.اے.اُردو

سمسٹرسوم

MASTER OF ARTS (URDU)

THIRD SEMESTER

غیرافسانوی نثر-۱

GHAIR AFSANVI NASR - 1

اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

ایم.اے.اُردو

MASTER OF ARTS (URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر دوم

THIRD SEMESTER

ایم.اے. یو.ایل - ۶۰۴ - غیرافسانوی نثر-۱

MAUL - 604 - GHAIR AFSANVI NASR - 1

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسراو. پی.ایس.نیگی، وائس چانسلر، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش (ڈائریکٹراسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیراحمدخاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی.جی.کالج، رام پور، اُترپردیش۔

ڈاکٹر شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر وکورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر پی.ڈی. پنت، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر وایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

C جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے ایم.اے. اُردو سالِ دوم، سمسٹر سوم، غیرافسانوی نثر-۱ کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypass)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی ورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''ماسٹر آف آرٹ'' کے تحت ''ایم.اے. اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایم.اے. اردو سالِ دوم، سمسٹر سوم، غیر افسانوی نثر-۱ کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۸/اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خودتدریسی مواد{SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تا کہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تا کہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

ایم.اے.اُردو

(M.A.URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر دوم

THIRD SEMESTER

ایم.اے. یو.ایل - ۶۰۴ - غیرافسانوی نثر-۱

MAUL - 604, GHAIR AFSANVI NASR - 1

اکائی نمبر مضمون	مضمون نگار	صفحہ
بلاک نمبر 01:		**5**
اکائی 1 مضمون نگاری کا فن	ڈاکٹر ثوبان سعید	6
اکائی 2 اردو کے اہم مضمون نگار	ڈاکٹر ثوبان سعید	21
اکائی 3 انشائیہ نگاری کا فن	ڈاکٹر احمد طارق	37
اکائی 4 اردو کے اہم انشائیہ نگار	ڈاکٹر احمد طارق	50
بلاک نمبر 02:		**69**
اکائی 5 خطوط نگاری کا فن	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	70
اکائی 6 اُردو کے اہم خطوط نگار	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	89
اکائی 7 طنز و مزاح کا فن	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	109
اکائی 8 اُردو کے اہم طنز و مزاح نگار	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	129

بلاک نمبر 01

اکائی 01	مضمون نگاری کافن	ڈاکٹرثوبان سعید
اکائی 02	اُردو کے اہم مضمون نگار	ڈاکٹرثوبان سعید
اکائی 03	انشائیہ نگاری کافن	ڈاکٹراحمد طارق
اکائی 04	اُردو کے اہم افسانہ نگار	ڈاکٹراحمد طارق

اکائی 01 مضمون نگاری کا فن

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : غیرافسانوی نثر کی تعریف

01.04 : مضمون کی تعریف

01.05 : مضمون نگاری کا فن

01.06 : مضمون نگاری کی ابتدا

01.07 : مضمون نگاری کی اقسام

01.08 : مضمون نگاری کے موضوعات

01.09 : مضمون اور انشائیہ میں فرق

01.10 : مضمون اور مقالہ میں فرق

01.11 : انشائیہ اور مقالہ میں فرق

01.12 : خلاصہ

01.13 : فرہنگ

01.14 : سوالات

01.15 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے تحت ہم اس بات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ نثری اصناف سے کیا مراد ہے؟ مختلف نثری اصناف کے ذیل میں کون کون سی اصناف شامل ہیں مزید یہ کہ غیرافسانوی نثر سے کیا مراد ہے اور اس ضمن میں معروف غیرافسانوی نثر میں مضمون نگاری ایک نثری صنف کی حیثیت سے کس مقام پر کھڑی ہے۔ اہم مضمون نگار کی فہرست میں کن ادیبوں اور نثر نگاروں کو اہمیت حاصل رہی اور کن خدمات کی بدولت ان کو تاریخ ادب میں یہ مقام حاصل ہوا۔ دراصل مضمون سے ذرا قریب کی نسبت رکھنے والی بعض اصنافِ نثری ایسی ہیں جن سے مضمون نگاری کا تصور خلط ملط ہوتا رہا ہے مثال کے طور پر مقالہ، انشائیہ وغیرہ۔ اس اکائی کے تحت یہ کوشش کی جائے گی کہ مضمون نگاری کے حقیقی خط وخال واضح کیے جائیں تاکہ دیگر اصنافِ نثری سے اس کو ممتاز کیا جاسکے۔

01.02 تمہید

جیسا کہ معلوم ہے ادب کے اظہار کی بنیادی طور سے دو ہیئتیں ہیں: نثر اور نظم۔ نظم کے دائرہ کے تحت غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی نیز دیگر شعری اصناف کے بارے میں اظہارِ خیال کیا جاتا ہے جب کہ نثری سرمایے میں داستان، افسانہ، ناول، مضمون، انشائیہ، مقالہ، خود نوشت، تنقید، خاکہ، سوانح نیز دیگر اصناف پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

01.03 غیرافسانوی نثر کی تعریف

اگر نثری اصناف کا جائزہ لیا جائے تو بنیادی طور سے نثری صنف بھی مزید دو ذیلی تقسیم رکھتی ہے ایک افسانوی نثر ہے جس کے تحت داستان، ناول، حکایات، کہانیاں، افسانے اور ڈرامے کی اصناف زیر بحث آتی ہیں وہیں غیرافسانوی نثر کے ذیل میں باقی اصناف کو رکھا جاتا ہے۔ غیرافسانوی نثر سے مراد یہ ہوتا ہے کہ نثر میں جو کچھ بیان کیا جارہا ہے وہ فرضی اور تخیلاتی نہیں ہے اس کے کردار فرضی دنیا کے کردار نہیں ہیں بلکہ غیرافسانوی نثر میں زندگی اور سماج کے مختلف حقائق کو ان اصناف کے تحت سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس صورت حال کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ سوانح میں کسی ہیرو کی زندگی کے تفصیلی اور مختصر، اہم اور غیر اہم حقیقی واقعات کی مدد سے اس کی سیرت و شخصیت نیز اس کے مثالی کردار سے بحث کی جاتی ہے نیز اس نے سماج اور معاشرے کے لئے کیا خدمات انجام دی ہیں اس پر بحث کی جاتی ہے اور اس کی شخصیت کا ایک مثبت تصور قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے تاکہ اس کے کردار و افعال نسلِ نو کے لئے رہنمائی اور مثال کا کام کرسکیں۔

خاکے میں کسی ہیرو یا پسندیدہ و ناپسندیدہ شخص کی زندگی کے محض چند گوشوں کو اُجاگر کرکے ایک تاثر دینے کی کوشش ہوتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھا تھا۔ اس کا عنوان تھا ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی'' اتفاق سے یہ اردو کا اولین خاکہ بھی ہے۔ اردو خاکے نے کافی لمبا سفر طے کرلیا ہے لیکن باوجود اس کے یہ خاکہ ابھی بھی مثالی اور منفرد ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے چند واقعات اور نذیر احمد کے عادات و خصائل کی مدد سے اس خاکے میں جو رنگ آمیزی کی ہے وہ نذیر احمد کو ایک زندۂ جاوید انسان کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ غرض خاکہ ایک ایسی غیرافسانوی نثری صنف ہے جس میں حقیقی واقعات کی ترتیب اس انداز سے قائم کی جاتی ہے کہ ممدوح اپنی تمام تر لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

اسی طرح انشائیے میں کسی واقعے کے بارے میں شخصی اور ذاتی نقطۂ نظر سے اظہار خیال ہوتا ہے۔ تنقید تخلیقی فن پارے کے محاسن و معائب کا احاطہ کرتی ہے، نیز مختلف اصول و نظریات کی روشنی میں تخلیق کو پرکھنے اور اس کی قدر متعین کرنے کا کام کرتی ہے۔ غرض یہ کہ غیر افسانوی نثر میں جتنی بھی اصناف شامل مطالعہ رہتی ہیں ان کا تعلق حقیقت، واقعیت نیز حقیقی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ اس کے کردار نہ تو فرضی ہوتے ہیں اور نہ ہی ان اصناف میں بیان کی گئی باتیں غیر حقیقی ہوتی ہیں۔ اسی لئے انہیں غیرافسانوی نثر کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ مضمون بھی غیرافسانوی نثر کی ایک اہم صنف ہے۔

01.04 مضمون کی تعریف

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نثری صنف کی حیثیت سے مضمون کی تعریف متعین کرلی جائے۔ اس بات کا تعین بھی کرلیا جائے کہ مضمون کے خدوخال کیا ہوتے ہیں۔ مضمون کا دائرۂ کار کیا ہے نیز یہ دیگر نثری اصناف سے کن اسباب کی بنا پر ممتاز ہوسکتا ہے۔

مضمون کا لفظ لغوی اعتبار سے عربی ہے، جس کے لغوی معنی ہیں ''ضمن میں لیے ہوئے۔'' مضمون کا لفظ شاعری میں تو بہت پہلے سے استعمال میں رہا ہے، مثال کے طور پر مرزا محمد رفیع سوداؔ کا یہ شعر تو بہت مشہور ہے:

کہتا ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

یا جب میر انیسؔ کہتے ہیں:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار خبر کرو مرے گلشن کے خوشہ چینوں کو

تو یہاں پر یہ لفظ بالکل دوسرے مفہوم کے لئے ادا کیا گیا ہے۔ نثر میں جن معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہ بہت بعد کی بات ہے۔ اب یہ لفظ اردو میں عام طور سے مناسب حجم کی ایسی سنجیدہ تحریر کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ بعض اوقات انشائیہ، مقالہ اور اسی قسم کی دیگر تحریروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

مضمون ایک وسیع لفظ ہے۔ مضمون میں ہم زندگی کے ہر شعبہ کو پیش کر سکتے ہیں لیکن خاص طور سے علمی، معلوماتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریات کو مضمون میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے سرسید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق میں جو مضامین لکھے ہیں ان میں سے بہتوں کو انشائیہ نہیں کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ان میں علمی مباحث نیز سیاسی مسائل پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ وہ مضمون کے دائرے میں آئیں گے۔ اس کے علاوہ مضامین چکبست کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہیں گے کیوں کہ ان میں علمی مباحث اور ادبی تنقید پر گفتگو کی گئی ہے۔ وحید الدین سلیم کی افاداتِ سلیم میں بھی ٹھوس فلسفیانہ اور علمی و ادبی مضامین ہیں اس لئے ان مضامین کو بھی انشائیہ نہیں مضمون کہا جائے گا۔

اس کے برخلاف انشائیہ مضمون نگاری کا وہ جزو ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو پیش کرتا ہے۔ اس پیش کش میں اس کی شخصیت کا انداز منعکس ہوتا رہتا ہے۔ اسی کو ہم آسانی کی غرض سے کہتے ہیں کہ انشائیے میں انشائیہ نگار کی شخصیت جھلکتی ہے اور اس کا نقطۂ نظر خالص طور سے انفرادی اور شخصی ہوتا ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے مگر مضمون میں ہمیشہ خارجی رنگ غالب رہتا ہے اس میں داخلی اور ذاتی رنگ کی گنجائش بہت کم رہتی ہے کیوں کہ مضمون کی بنیاد ہی صداقت، شہادت، ثبوت، دلائل، منطقیت، نتائج پر قائم ہوتی ہے۔

01.05 مضمون نگاری کا فن

کسی بھی عنوان پر دل چسپ اور جامع مواد کو ترتیب، تسلسل اور سائنسی انداز میں پیش کرنا یا کسی موضوع پر ترتیب کے ساتھ تحریری اظہار خیال کرنا مضمون نگاری کہلاتا ہے۔ اس صنف کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس کے تحت ادب، سائنس، مذہب، ٹکنالوجی، امراض و علاج، طب، سیاست و سماج غرضیکہ تمام جہاتِ انسانی اس کے دائرے میں سمٹ آتے ہیں۔ عام طور پر کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کے لئے معلومات کو مناسب انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے اور یہ بھی مطالعے میں آیا ہے کہ مضمون ایک ہی نشست میں مکمل کر لینے کی چیز ہوتا ہے۔ اس کی سائز مختصر اور طویل ہو تو سکتی ہے لیکن عملی طور سے مضمون ایک ہی نشست میں تکمیل کا تقاضا کرتا ہے۔

مضمون نگاری دراصل انسان کے مافی الضمیر کو بہت واضح، ٹھوس اور مدلل انداز میں پیش کرنے کا فن ہے۔ اس صنف نثر میں خیال کی وضاحت، اس کا سائنسی انداز اور طریقۂ پیش کش اسے دیگر اصناف سے امتیاز عطا کرتا ہے۔ چوں کہ مضمون نگاری میں بات کہنے کا براہِ

راست طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس لئے اس میں اثر پذیری اور افہام وتفہیم کی زیادہ گنجائش رہتی ہے۔ایک مضمون نگار جب مطالعہ ومشاہدہ کی بلند منزل پر پہنچتا ہے تو اس کی تحریر میں فکر کی گہرائی اور بیان کی وضاحت جیسی خوبیاں داخل ہوجاتی ہیں اور انھی خوبیوں کی بدولت مضمون نگار کی تحریر میں سنجیدگی، اعتدال اور غور وفکر کی پرچھائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔

مضمون نگاری میں چوں کہ براہِ راست گفتگو قاری سے ہوتی ہے اور براہِ راست انداز میں ہوتی ہے اس لئے اس صنف میں خیالی اور غیر حقیقی مسائل پر اظہار کی گنجائش نہیں رہتی۔اس صنف میں زندگی کا رشتہ براہ راست ادب سے استوار ہوتا ہے۔سائنسی انداز فکر کو فروغ دینے میں مضمون نگاری کی بہت اہمیت رہی ہے۔اس صنف نے انسانی زندگی کے مسائل کو حقیقی زمین پر کھڑا کرنے کا کام کیا۔اس کے علاوہ مضمون نگاری کی انگلیاں رفتارِ زمانہ کی نبض پر بھی رہتی ہیں۔ایک مضمون نگار معاصر زندگی کے پیچ وخم اور اس معاشرے کی ذہنی ونفسیاتی کیفیتوں سے واقفیت رکھتا ہے اور معاشرے کے مسائل کو زبان عطا کرتا ہے اس طرح مضمون نگاری صحیح معنوں میں معاصر تاریخ نگاری کا کام بھی کرتی رہی ہے۔مضمون میں ہر جملہ عنوان کی وضاحت کرتا جاتا ہے اور ہر بات مرکزی خیال کی تشریح کرتی ہے۔اور اس کے لئے مضمون نگار استدلال، قوّتِ فکر، صراحت ووضاحت کا سہارا لیتا ہوا اپنی بات کو مکمل کرتا ہے۔مضمون میں بات کو عالمانہ انداز میں کہا جاتا ہے اسی لئے مضمون کی فضا پر سنجیدگی کا غلبہ رہتا ہے نیز ہر جملہ ایک خاص قسم کی فکر کی دعوت دیتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔علم ودانش اور حکمت کے مسائل اس کا بنیادی وصف ہوتے ہیں۔مضمون نگاری کی بدولت اردو میں منطقی انداز کا شعور عام ہوا۔ورنہ اس سے پہلے داستانوں کی حکومت تھی اور داستانی اسلوب تفصیلی انداز میں تخیلاتی دنیا کی کہانی بیان کرتا تھا۔قطعیت، اسلوب کی سادگی، روانی اور سلاست، منطقی ربط یہ تمام خواص مضمون نگاری کے اہم عناصر ہیں۔مضمون کا موضوع یا مسئلہ معاصر زندگی سے متعلق بھی ہوسکتا ہے نیز ماضی ومستقبل کے عہد پر بھی محیط ہوسکتا ہے یعنی مضمون میں زمان ومکان کی حد بندیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔البتہ مضمون کے بنیادی اوصاف میں یہ بات شامل ہے کہ اس کی پوری فضا علمیت اور سنجیدگی کی حامل ہو۔انشائیوں میں عام طور سے شخصی انداز تحریر میں شامل ہوجاتا ہے، مضمون اس کے برعکس غیر شخصی، غیر جانب دارانہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔یہ علاحدہ بات ہے کہ گاہے بگاہے شخصی ترجیحات اصولوں اور نظریات کی سطح سے اوپر محسوس ہونے لگتے ہیں۔پھر بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انشائیوں کے مقابلے میں مضامین کے اندر زیادہ علمیت، زیادہ سنجیدگی اور زیادہ غیر جانب داری کے عناصر نظر آتے ہیں۔اس کی علمی سطح بہت بلند ہوتی ہے نیز اس کا وقار زیادہ نمایاں رہتا ہے۔

گویا کسی بھی موضوع پر معلومات یکجا کر کے اور زیر بحث موضوع کو اگر ضرورت ہو تو مزید ذیلی عناوین میں تقسیم کر کے دل چسپ اور جامع مواد کو تسلسل اور روانی کے ساتھ پیش کرنا یا کسی موضوع پر مواد کو ترتیب سے پیش کرنا یا اس موضوع پر تحریری اظہار خیال کرنا مضمون کہلاتا ہے۔مضمون کو عام طور سے تین اجزا میں تقسیم کیا جاتا ہے:

﴿۱﴾ **تمہید:**۔جس میں متعلقہ موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے اس کے متعلقات کا ذکر کیا جاتا ہے نیز اس کے بارے میں تعارفی گفتگو کی جاتی ہے۔

﴿۲﴾ **نفس مضمون:**۔اس حصہ میں زیرِ نظر موضوع کی جملہ تفصیلات کا بیان مقصود ہوتا ہے۔مضمون نگار مختلف دلائل وشواہد کی مدد سے اپنے نظریہ کی حمایت میں ثبوت فراہم کرتا ہے اور قاری کو اپنے حق میں قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ بہت اہم اور بنیادی حصہ ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ **خاتمہ:**۔اس آخری حصے میں مضمون نگار اپنے ثبوت و دلائل کی روشنی میں نتائج اخذ کرنے کا کام کرتا ہے۔یہی مضمون نگاری کا مقصد ہوتا ہے کیوں کہ اخذ نتائج ہی کسی مضمون کا ماحصل ہوتا ہے۔دراصل یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں مضمون نگار تمہید اور نفس مضمون کے منازل سے گزرتا ہوا پہنچنے اور قاری کو لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔

01.06 مضمون نگاری کی ابتدا

تاریخ کے اوراق اس بات پر شاہد ہیں کہ اردو مضمون نگاری کی ابتداد ہلی کالج میں قران السعدین سے ہوئی۔اس سے قبل مضمون نگاری میں موضوعات کا دائرہ محدود ہوتا تھا اور چند گنے چنے موضوعات پر ہی مضامین قلم بند کیے جاتے تھے۔ان موضوعات میں بیش تر حصہ مذہبی موضوعات کا احاطہ کرتا تھا۔یہ دہلی کالج کا فیضان تھا کہ اس کالج سے شائع شدہ رسائل کی بدولت مضمون نگاری کے دائرے میں وسعت پیدا ہوئی اور بہت کم مدت میں مضمون نگاری کا سرمایہ متمول ہونے لگا۔اخلاقی،سائنسی،مذہبی،بین مذہبی،علمی،فلسفیانہ اور دیگر عمومی موضوعات پر کثرت سے مضامین لکھے گئے جس سے اس صنف نے بڑی تیزی سے ترقی کے منازل طے کیے۔اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا و ارتقا کے سلسلے میں اختلاف رائے موجود ہے۔

بعض تنقید نگاروں نے دہلی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر کو اور بعض دیگر نقادوں نے سرسید احمد خاں کو اردو مضمون نگار کا بانی تسلیم کیا ہے۔تاریخی طور سے یہ بات مصدقہ ہے کہ اردو میں مضمون نگاری کا آغاز دہلی کالج کے ہفتہ وار رسالے ''قران السعدین'' سے ہوا ہے۔کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الواس اشپرنگر نے ۱۸۴۵ء میں اس کا اجرا کیا تھا۔طلبا کو کوئی عنوان دے دیا جاتا تھا اور اسی کے تحت وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔اس طرح سے قلیل مدت میں ہی مختلف موضوعات یعنی سائنسی،ادبی،مذہبی اور تاریخی موضوعات پر غور و فکر اور اظہارِ خیال کی ایک روایت قائم ہوگئی۔

رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

> ''اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید احمد خاں سے ہوا۔انہوں نے مذہبی،سیاسی،ادبی،علمی، معاشرتی،تاریخی،فلسفیانہ اور دیگر موضوعات پر بکثرت مضامین لکھ کر ہم عصر ادیبوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔''
>
> ''ایک دوسری محقق سیدہ جعفر نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ان کے مطابق سرسید احمد خاں اردو کے اولین مضمون نگار نہیں۔''

ان کے بقول:

> ''مضمون نگاری کے ارتقا میں سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں۔ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی۔رام چندر نے مضمون کے فارم کو خیالات اور جذبات کے اظہار کی سہولت بخش اور غیر رسمی ذریعۂ اظہار محسوس کرتے ہوئے اس صنف کو اپنایا تھا۔سرسید احمد خاں کے مضامین اس ابتدا کا نکھرا ہوا اور ترقی یافتہ روپ ہیں۔''

لہٰذا انکار کی گنجائش نہیں کہ ماسٹر رام چندر اردو کے اولین مضمون نگار ہیں جنہوں نے انگریزی ادب کے زیر اثر مختلف موضوعات پر سب سے پہلے مختصر مضامین لکھنے کا آغاز کیا اور بعض انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ پیش کیا۔ گویا مضمون نگاری کے حوالہ سے ماسٹر رام چندر سرسید احمد خاں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن رام چندر کے مضامین ادبی لحاظ سے کوئی خاص وقعت نہیں رکھتے۔ ان کے مضامین میں وہ سلاست و روانی اور تازگی نہیں جو سرسید کے مضامین میں پائی جاتی ہے۔ رام چندر کے مضامین کی زبان ناپختہ ہے۔ انہوں نے انگریزی سے جو مضامین اُردو میں منتقل کیے وہ لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی ان خامیوں کی وجہ سے ان کی اولیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ زبان و بیان کی خامیوں کے باوجود وہی اردو کے پہلے مضمون نگار کہے جانے کے مستحق ہیں کیوں کہ اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا تھا۔

01.07 مضمون نگاری کی اقسام

صورت حال یہ ہے کہ اگر مضامین کو ذیلی عناوین میں تقسیم کیا جائے تو بیسیوں ذیلی اقسام سامنے آئیں گی۔ اردو مضمون نگاری کے سرمایے میں موضوعاتی نقطۂ نظر سے بہت تنوع پایا جاتا ہے چنانچہ ادبی، تنقیدی، لسانیاتی، تحقیقی غرض ہر زاویے سے مضامین لکھے گئے ہیں اس طرح اردو مضمون نگاری کے سرمایے میں مستقل طور سے اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس طرح سے اگر موضوعات کی نوعیت اور مواد کی پیش کش کے اعتبار سے مضمون نگاری کی اقسام متعین کی جائیں تو اس ذیل میں تنقیدی، سماجی، تعلیمی، سیاسی، ادبی، سوانحی، تہذیبی و معاشرتی، سائنسی، علمی، تحقیقی، طنزیہ و مزاحیہ، رومانی وغیرہ اقسام شامل کی جاسکتی ہیں۔

تنقیدی مضامین اردو میں اس کثرت سے لکھے گئے ہیں کہ ان کا گوشوارہ تیار کرنا خارج از امکان ہے پھر بھی جن اہل قلم کے مضامین تنقید کے معیار و میزان پر کھرے اُترتے ہیں ان میں کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی کے مضامین خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین مکمل طور سے تنقیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اہل قلم کی کتابیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے پہل ان حضرات نے تنقیدی مضامین ہی سپرد قلم کیے تھے اور پھر وہی مضامین مناسب ترمیم و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ تحقیقی مضامین لکھنے والوں میں قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، مالک رام، نذیر احمد، گیان چند جین اہمیت رکھتے ہیں۔ لسانیاتی مضمون نگاروں میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری، گوپی چند نارنگ کی تحریریں اہمیت رکھتی ہیں۔ علمی اور فکری مضامین میں ڈاکٹر عابد حسین اور خواجہ غلام السیدین کے مضامین قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان تمام نثر نگاروں نے اپنی کاوشوں سے اردو نثر اور خاص طور سے اردو مضمون نگاری کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے اور نثر کے علمی وقار اور شان میں چار چاند لگائے ہیں۔

مضمون نگاری کی ایک قسم رومانوی ہے جس میں حسن و عشق کی نیرنگیاں اور تاریخی واقعات کی جذباتی انداز میں تصویر کشی کی جاتی ہے۔ اس طرح کے مضامین کے روحِ رواں عبدالحلیم شرر ہیں۔ شرر اردو کے مشہور تاریخی ناول نگار ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے مشہور رسالہ دلگداز میں انہوں نے تاریخی اور ادبی نوعیت کے مضامین لکھ کر مضمون نگاری کی تاریخ میں بھی اپنی جگہ محفوظ کر لی۔ ان کے مضامین میں جوش و جذبہ کی فراوانی، نثر کا حسن اور تخیل کا کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اسی تسلسل میں سجاد حیدر یلدرم اور شیخ عبدالقادر کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان قلم کاروں نے بھی اپنے مضامین کی بدولت اردو کی رومانوی نثر کے سرمایے میں اضافہ کیا اور انسانی فطرت کے رومانی پہلوؤں کو ادب کا موضوع بنایا۔

طنزیہ ومزاحیہ مضمون نگاری کی داغ بیل اودھ پنچ کے ہاتھوں پڑی تھی۔ معاشرے کی ناہم وَاریوں اور زوال پذیر سماج کی عکاسی اودھ پنچ میں شائع مضامین کا خاصہ ہے۔ یہ رسالہ سرسید کی فکر کی مخالفت اور مشرقی تہذیب اور طرزِ زندگی کی حمایت میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے جو بذاتِ خود اچھے مضمون نگار تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت سارے ہم خیال ادیبوں اور نثر نگاروں کی جماعت تیار کی جو اودھ پنچ کے لئے مضامین قلم بند کرتے تھے۔ اکبرالہ آبادی جیسے نثر نگار اودھ پنچ سے متعلق رہ چکے تھے۔ مضامین کی ایک قسم تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے۔ تحقیق نام ہے معلوم حقائق کی تصحیح کرنا اور نا معلوم حقیقتوں کو تلاش کرنا۔ اردو میں سرسید کے مضامین سے اس کی ابتدا ہوتی ہے لیکن تحقیقی مضامین بیسویں صدی میں کثرت سے لکھے گئے۔ اس قسم کے مضامین لکھنے والوں میں محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، مولانا امتیاز علی عرشی بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ تحقیقی مضمون کے لئے حقائق کی تلاش اور ان سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت ضروری تصور کی جاتی ہے۔ یہ ایک خشک اور تاریک وادی ہے جہاں بصیرت اور منطقی ذہن ہماری رہ نمائی کرتے ہیں۔ تحقیقی مضامین میں ہوا میں گرہ نہیں لگائی جاسکتی اس کی بنیاد حقائق وشواہد اور دلائل پر استوار ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا اسلوب بھی صاف، منطقی اور واضح ہونا چاہیے۔

محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو لکھ کر نئی حقیقتیں دریافت کیں۔ انہوں نے پچھلی تحقیق کا اعتراف کرتے ہوئے نئی نئی حقیقتوں اور شواہد کی روشنی میں اردو کے تحقیقی قافلے کو ایک نئی راہ پر لگانے کا کام کیا۔ مولوی عبدالحق نے قدیم ادبی شہ پاروں پر مقدمات لکھ کر انہیں گم نامی سے باہر نکالا اور تحقیق کے میدان میں مضامین کی اہمیت کو واضح کیا۔ عرشی صاحب نے غالبؔ کے مکاتیب اور دیوان کا تنقیدی ایڈیشن شائع کیا نیز متعدد مقالات سے صالح تحقیقی روایت کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ اس طرح مختلف موضوعات پر ہزاروں کی تعداد میں مضامین لکھے گئے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ ان تمام مضامین کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ مضمون نگاری نے زندگی کے حقیقی مسائل کو زمین پر اُتارا اور فکشن کے اس تصور کو باطل کر دیا جو غیر حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔ اس صنف نے نثر میں منطقی انداز، سائنسی نقطۂ نظر اور غیر جانب دارانہ شعور کی پرورش کی اور زندگی کی اصلی کہانیوں کو داستانوں کی مصنوعی اور تخیلاتی دنیا سے باہر نکالنے کا کام کیا۔ افراد میں کائنات کے مسائل کا حقیقی شعور پیدا کیا اور موضوعات میں رنگارنگی کی فضا قائم کی۔ ان مضامین کے موضوعات شعروادب، تحقیق وتنقید، لسانیات، تاریخ ادب، سائنس و جغرافیہ، ادیان ومذاہب، سیاست واقتصادیات؛ غرض کہ سماجی اور مذہبی علوم کی جملہ شاخوں کا احاطہ کرتے تھے اس کے علاوہ دیگر علوم انسانی پر تبادلۂ خیال کی روایت پروان چڑھانے میں ان مضامین کا بہت ہی اہم کردار شامل رہا ہے۔

مضمون نگاری کی اسی روایت کی بدولت اردو میں تنقید نے تذکروں کی دنیا سے خود کو علاحدہ کیا اور اپنی شناخت قائم کی۔ مولانا حالی، شبلی نعمانی اور مولوی محمد حسین آزاد کے مضامین ہی درحقیقت اردو تنقید میں میل کا پتھر ثابت ہوئے۔ ان کی زبان سادہ وسلیس تھی لیکن جو نکات و خیالات ان میں بیان کیے گئے تھے وہ اردو شاعری کے تنقیدی سرمایے میں اضافہ کرتے رہے۔ بعد کے نثر نگاروں نے بھی اس روایت سے فیض اٹھایا اور اسی طرز پر مضمون نما تنقیدی نمونے پیش کرتے رہے۔ جن کا بنیادی وصف غیر جانب داری اور سائنسی انداز ہوتا تھا۔ انھی مختلف الجہات مضامین کی بدولت اردو تنقید وتحقیق کی دنیا متمول اور مال دار ہوتی رہی۔

مضمون نگاری کی روایت کو فروغ دینے میں اردو رسائل کا بھی حصہ ہے۔ جب پریس کی سہولیات میں اضافہ ہوا اور طباعت کا کام آسانی سے ہونے لگا تو رسائل کی گرم بازاری نے مضمون نگاری کے تنوع میں بہت اضافہ کیا۔ مذہبی، سیاسی، ادبی، سماجی، معاشرتی غرض ہر

موضوع پر مخصوص رسائل جاری کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور متنوع مضامین منظر عام پر آنے لگے۔تفریحی اور سائنسی، علمی اور مذہبی شاید ہی کوئی موضوع ایسا رہا ہو جس پر مخصوص رسائل شائع نہ ہوتے ہوں۔اس طرح سے مضامین نے ذہنِ انسانی کو مختلف الجہات بنانے کا کام کیا اور اس کی معرفت ایک ایسی نسل کی تربیت کی آبیاری کی جو بیک وقت زندگی کے مختلف مظاہر و مسائل سے نہ صرف بخوبی واقفیت حاصل کرتی رہی بلکہ پورے معاشرے پر اس عمل کے مثبت اثرات مرتب ہوتے رہے۔یہ مضمون نگاری کا کمال تھا کہ اس کی بدولت اردو زبان کی لفظیات میں بہت اضافہ ہوا۔سماجی علوم، سائنسی علوم، ادب و ادبیات کی نئی نئی لفظیات اور ذخیرۂ الفاظ سے اردو کا دامن مالا مال ہوا۔ترجمے کی بدولت دیگر زبانوں کے الفاظ اور تہذیبی علامتوں کی بدولت اردو کی تہذیبی دنیا وسعتوں سے ہم کنار ہوئی۔

01.08 مضمون نگاری کے موضوعات

موضوعات کے نقطۂ نظر سے مضمون کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔مضمون کی کامیابی کا راز اس کی ترتیب و تنظیم کے حسن میں پوشیدہ ہے۔ ایک اچھے مضمون میں موضوع یا مسئلے کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ زیرِ نظر موضوع کی جملہ جہات زیرِ بحث آ جائیں۔تمہیدی حصہ میں موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے جس سے موضوع کی اہمیت کھل کر سامنے آتی ہے نیز اس کے مضمون نگار کی منشا بھی پوری طرح سامنے آ جاتی ہے۔پھر رفتہ رفتہ منطقی جواز کے سہارے اہم اہم نکات روشن کیے جاتے ہیں اور اس کے مبہم گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔انتشار سے دامن بچاتے ہوئے اور استدلال کے سہارے ضروری وضاحت اور طرزِ بیان کی دل کشی کے ساتھ گفتگو کو کسی نتیجے تک پہنچانے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس انداز سے کہ یہ نتیجہ ہر پہلو سے منطقی معلوم ہو۔مضمون نگار کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنی بات کو اس انداز سے کہے کہ ابلاغ کا المیہ پیدا نہ ہو اور بات دل سے نکل کر دل میں بیٹھ جانے کی قوت رکھتی ہے۔یہ نکتہ اور خوبی دراصل اسلوب سے پیدا ہوتا ہے اس لئے مضمون نگار کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ان نکات پر بھرپور توجہ دے اور ابہام اور پیچیدگی نیز مشکل عبارت آرائی سے اپنے خیالات کو مزید گنجلک نہ بنائے۔صراحت و وضاحت مضمون نگاری کی بنیادی صفات ہیں۔الفاظ اور جملوں کے دروبست میں جس قدر قطعیت اور شفافیت کے عناصر موجود ہوں گے مضمون نگاری کا حق اسی قدر بہتر ادا ہو سکے گا۔

01.09 مضمون اور انشائیہ میں فرق

مضمون کا لفظ انگریزی لفظ **Essay** کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن اردو میں کئی الفاظ کم و بیش ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال میں ہیں جیسے مقالہ، مضمون یا انشائیہ اب **Essay** کا لفظ انشائیے کے طور پر معروف ہے۔اس کے باوجود بعض مقامات پر ایک الجھن رہتی ہے کہ ہمارے ادیبوں کے ذہن میں ان اصناف کے اصولی تصوّر کو لے کر خلط مبحث رہا ہے۔مثال کے طور پر پطرس نے اپنے انشائیوں کو مضامین کہا ہے ان کی کتاب کا نام ہے ''مضامین پطرس''۔مرزا فرحت اللہ بیگ کے انشائیے ''مضامینِ فرحت'' کے نام سے شائع ہوئے اور اسی طرح رشید احمد صدیقی کی کتاب مضامین رشید کے نام سے معروف ہے۔گویا یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے بعض ادیبوں کے ذہن میں بھی ان دو اصناف کے تعلق سے کوئی واضح تقسیم نہیں تھی۔

سید محمد حسنین کے خیال میں انشائیہ کی تعریف کچھ اس طرح ہے:

''انشائیہ ادب کی وہ کمین گاہ ہے جہاں قلم کار بیٹھ کر جس پر چاہے تیر چلا سکتا ہے۔ اکرام و دشنام سے بے پروا ہو کر وہ ہر نام اور کام کی عظمت اور ذلت کا محاسبہ کر سکتا ہے۔ یہ گفتار کا وہ غازی ہے جسے سات نہیں سیکڑوں خون معاف ہیں۔''

عبدالماجد دریابادی نے انشائیہ کی مختصر تعریف یہ کی ہے:

''انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسنِ انشا، یہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ انشائیہ وہ جس میں بجائے مغز و مضمون کے اصل توجہ حسنِ عبارت پر ہو۔''

ان تعریفات کے برخلاف مضمون کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی یوں رقم طراز ہیں:

''کسی متعین موضوع پر اپنے خیالات اور جذبات و احساسات کا تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ دنیا کے ہر معاملے، مسئلے یا موضوع پر مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ مضمون کی بالعموم ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے زیرِ بحث مسئلے کا تعارف کرایا جاتا ہے پھر اس کی حمایت یا مخالفت میں دلائل دیئے جاتے ہیں اور آخر میں نتیجہ پیش کیا جاتا ہے۔ بعض مضامین تاثراتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایسی ترتیب اور دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ مضمون کے لئے نظم و ضبط اور توازن و تناسب ضروری ہے۔''

ان مختلف اقتباسات سے یہ معلوم ہوا کہ مضمون ایک خاص قسم کی سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے جب کہ انشائیہ حجم میں مضمون کے برابر ہوتے ہوئے اندرونی مزاج کی بدولت اس سے مختلف ہے۔ انشائیے میں ذاتی تجربات و تاثرات کی بہت اہمیت ہے جب کہ مضمون میں شواہد اور خارجی دلائل کو اہمیت حاصل ہے۔ مضمون میں نتیجہ واقعات، ان کی پیش کش، دلائل اور شواہد کی روشنی میں اخذ کیا جاتا ہے جب کہ انشائیے میں کوئی نتیجہ نکالا ہی نہیں جاتا۔ یہ تحریر محض تاثراتی اور نجی تجربات کی حامل ہوتی ہے۔

01.10 مضمون اور مقالہ میں فرق

مضمون اور مقالہ کی اصطلاح بھی کم و بیش مرادف کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے، مثلاً مقالاتِ شبلی، مقالاتِ حالی، مقالاتِ سرسید وغیرہ جب کہ ان جملہ کتابوں میں سنجیدہ اور علمی مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضمون اور مقالے کے فرق کو واضح کر دیا جائے۔ مقالہ عام طور پر سنجیدہ موضوعات پر لکھا جاتا ہے۔ اس کے اقسام موضوعات کی بنیاد پر طے کرنا مناسب ہوگا، ضخامت یا اختصار کی بنیاد پر نہیں۔ عام طور سے مضمون یا انشائیہ دو چار صفحات سے لے کر دس بیس صفحات تک پھیلا ہوتا ہے۔ بعض مضامین کا حجم اس سے قدرے زیادہ بھی ہو سکتا ہے لیکن مقالہ ایسی کسی پابندی کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ چالیس پچاس صفحات سے شروع ہو کر ہزار صفحات تک پھیلایا جا سکتا ہے۔ شبلی کے مقالات مختصر مقالات کی فہرست میں آئیں گے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے اس حد بندی کے دوسرے کنارے پر ہیں۔

مقالہ اور مضمون میں باہمی یکسانیت ضرور پائی جاتی ہے۔ مقالہ نگاری دراصل مضمون نگاری کی ارتقائی اور توسیعی شکل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مختصر تحریر کو مضمون کے نام سے نیز طویل وضخیم تحریر کو مقالہ کہا جاتا ہے۔ موضوعات کی سطح پر دونوں میں بہت قریب کی نسبت ہے یعنی جو موضوعات مضمون کی قلم رو میں شامل ہیں مقالہ بھی انھی موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

بہر حال مقالہ اور مضمون میں پہلا فرق تو یہ ہے کہ مضمون عموماً مختصر اور مقالہ نسبتاً طویل ہوتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مضمون میں کسی موضوع کے چند پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے جب کہ مقالے میں موضوع کے جملہ یا بیش تر پہلوؤں کا محاکمہ ہوتا ہے۔ البتہ معروضی انداز، طرزِ استدلال، ربط وتوازن اور سنجیدہ فضا کے معاملے میں مضمون اور مقالے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

مضمون کی اصطلاح ہر قسم کے مضامین کے لئے بلاتکلف استعمال کی جاتی ہے چنانچہ علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، سوانحی، فلسفیانہ، سیاسی اور اصلاحی موضوعات پر مختصر تحریریں مضمون کے ذیل میں ہی آتی ہیں۔ مضمون نگاری کی ایک قسم مختصر مضامین کی ہے جس میں کسی موضوع پر چار پانچ صفحات میں غیر ضروری باتوں سے دامن بچاتے ہوئے موضوع کے ضروری متعلقات کا بیان کر دیا جاتا ہے۔ اردو میں مضمون نگاری کا بیش تر سرمایہ اسی نوعیت کا ہے۔ مقالاتِ شبلی کے مضامین ہوں یا مقالاتِ سرسید کے، مضامین رشید ہوں یا مضامینِ پطرس۔ ان سبھی میں مضامین کا حجم اسی قدر رہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مضمون ایک ایسی صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی ایک موضوع پر چند صفحات میں سنجیدگی سے کوئی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہو۔ طنزیہ ومزاحیہ اور غیر رسمی تحریروں کے لئے باقاعدہ اصناف مقرر کر لی گئی ہیں۔

01.11 انشائیہ اور مقالہ میں فرق

انشائیہ اور مقالہ میں کافی فرق ہے۔ انشائیہ مختصر ہوتا ہے اور مقالہ کافی طویل ہوتا ہے۔ مقالہ کی تکمیل کے لئے کافی چھان بین اور تحقیق وتدقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں سے بالتفصیل بحث کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مقالے کا انداز بیان بھی کافی سنجیدہ ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں نظامی عروضی سمرقندی کا ''چہار مقالہ'' بہت مشہور ہے اس میں چار مقالات ہیں جن میں کافی کاوش اور عرق ریزی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ ان مقالات کو ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اردو میں مقالاتِ شبلی، مقالاتِ حالی، مقالاتِ آزاد موجود ہیں۔ سرسید کی بعض تصانیف مثلاً خطباتِ احمدیہ اور اکثر مضامین تہذیب الاخلاق ایسے موضوعات پر اور اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان سے پہلے اردو کیا عربی اور فارسی میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ سرسید کی کتابوں سے زیادہ ان کے مضامین مفید ہیں جن سے اُردو میں فن مقالہ نگاری پیدا ہو گیا۔

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح مقالہ اور مضمون میں باوجود قریبی نسبت کے اچھا خاصا فرق موجود ہے اسی طرح انشائیہ اور مقالہ میں بھی سنجیدگی اور ظرافت کے تعلق سے فرق کیا جا سکتا ہے۔ مقالہ طوالت کا حامل ہوتا ہے، جب کہ انشائیہ طوالت کا بار سے برداشت نہیں کر سکتا۔ جتنے بھی بہترین انشائیے ہیں وہ اختصار کی خوبی کے حامل ہیں۔ انشائیہ میں ہمیشہ ہی اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ اس کا نقطۂ نظر ذاتی اور شخصی ہوتا ہے جب کہ مقالے میں مقالہ نگار اس کے اصول وضوابط اور دیگر فنی لوازمات کی پابندی کا اسیر رہتا ہے۔ غرض یہ تینوں اصناف نثری علاحدہ ہوتے ہوئے بھی عام قاری کے لئے خلط مبحث کا سبب بنتی رہی ہیں جس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ بیش تر نقاد اور محققین جب ان اصناف کا ذکر کرتے ہیں اور مثالوں سے اپنے نظریات کی توثیق کرتے ہیں تو کم وبیش وہی مثالیں مختلف نثری اصناف کے تحت ذکر کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کی سہل انگاری عام قاری کے لئے اُلجھن کا باعث ہوتی ہے۔

01.12 خلاصہ

ادب میں اظہار کی بنیادی طور پر دو ہیئت ہیں: نثر و نظم۔ نظم کے تحت غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی نیز دیگر شعری اصناف کے بارے میں اظہارِ خیال کیا جاتا ہے جب کہ نثری سرمایے میں داستان، افسانہ، ناول، مضمون، انشائیہ، مقالہ، خودنوشت، تنقید، خاکہ، سوانح نیز دیگر اصناف پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اگر نثری اصناف کا جائزہ لیا جائے تو بنیادی طور سے نثری صنف بھی مزید دو ذیلی تقسیم رکھتی ہے۔ ایک افسانوی نثر، جس کے تحت داستان، ناول، حکایات، کہانیاں، افسانے اور ڈرامے کی اصناف زیر بحث آتی ہیں۔ وہیں غیر افسانوی نثر کے ذیل میں باقی اصناف کو رکھا جاتا ہے۔ غیر افسانوی نثر سے مراد یہ ہوتا ہے کہ نثر میں جو کچھ بیان کیا جارہا ہے وہ فرضی اور تخیلاتی نہیں ہے اس کے کردار فرضی دنیا کے کردار نہیں ہیں بلکہ غیر افسانوی نثر میں زندگی اور سماج کے مختلف حقائق کو ان اصناف کے تحت سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مضمون ایک وسیع لفظ ہے۔ مضمون میں ہم زندگی کے ہر شعبہ کو پیش کر سکتے ہیں لیکن خاص طور سے علمی، معلوماتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریات کو مضمون میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے سرسید احمد خاں کے تحریر کردہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں سے بہتوں کو انشائیہ نہیں کہا جاسکتا ہے کیوں کہ ان میں علمی مباحث نیز سیاسی مسائل پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ وہ مضمون کے دائرے میں آئیں گے۔ اس کے علاوہ مضامینِ چکبست کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہیں گے کیوں کہ ان میں علمی مباحث اور ادبی تنقید پر گفتگو کی گئی ہے۔ وحیدالدین سلیم کی افاداتِ سلیم میں بھی ٹھوس فلسفیانہ اور علمی و ادبی مضامین ہیں اس لئے ان مضامین کو بھی انشائیہ نہیں مضمون کہا جائے گا۔ سرسید کی بعض تصانیف مثلاً خطباتِ احمدیہ اور اکثر مضامین تہذیب الاخلاق ایسے موضوعوں پر اور اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان سے پہلے اردو کیا عربی اور فارسی میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ سرسید کی کتابوں سے زیادہ ان کے مضامین مفید ہیں جن سے اردو میں فن مقالہ نگاری پیدا ہوگیا۔

مقالہ اور مضمون میں باوجود قریبی نسبت کے اچھا خاصا فرق موجود ہے اسی طرح انشائیہ اور مقالہ میں بھی سنجیدگی اور ظرافت کے تعلق سے فرق کیا جاسکتا ہے۔ مقالہ طوالت کا حامل ہوتا ہے جب کہ انشائیہ طوالت کا بار سے برداشت نہیں کرسکتا۔ جتنے بھی بہترین انشائیے ہیں وہ اختصار کی خوبی کے حامل ہیں۔ انشائیہ میں ہمیشہ ہی اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ اس کا نقطۂ نظر ذاتی اور شخصی ہوتا ہے جب کہ مقالے میں مقالہ نگار اس کے اصول وضوابط اور دیگر فنی لوازمات کی پابندی کا اسیر رہتا ہے۔ غرض یہ تینوں اصناف نثری علاحدہ ہوتے ہوئے بھی عام قاری کے لئے خلط مبحث کا سبب بنتی رہی ہیں جس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ بیش تر نقاد اور محققین جب ان اصناف کا ذکر کرتے ہیں اور مثالوں سے اپنے نظریات کی توثیق کرتے ہیں تو کم وبیش وہی مثالیں مختلف نثری اصناف کے تحت ذکر کردیتے ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کی سہل نگاری عام قاری کے لئے الجھن کا باعث ہوتی ہے۔

کسی بھی عنوان پر دل چسپ اور جامع مواد کو ترتیب، تسلسل اور سائنسی انداز میں پیش کرنا یا کسی موضوع پر ترتیب کے ساتھ تحریری اظہار خیال کرنا مضمون نگاری کہلاتا ہے۔ اس صنف کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس کے تحت ادب، سائنس، مذہب، ٹکنالوجی، امراض وعلاج، طب، سیاست وسماج غرضیکہ تمام جہاتِ انسانی اس کے دائرے میں سمٹ آتے ہیں۔ عام طور پر کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کے لئے معلومات کو مناسب انداز میں پیش کردیا جاتا ہے اور یہ بھی مطالعے میں آیا ہے کہ مضمون ایک ہی نشست میں مکمل کر لینے کی چیز ہوتا ہے۔ اس کی سائز مختصر اور طویل ہوتو سکتی ہے لیکن عملی طور سے مضمون ایک ہی نشست میں تکمیل کا تقاضا کرتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر معلومات یکجا کر کے

اور زیرِ بحث موضوع کو اگر ضرورت ہو تو مزید ذیلی عناوین میں تقسیم کر کے دل چسپ اور جامع مواد کو تسلسل اور روانی کے ساتھ پیش کرنا یا کسی موضوع پر مواد کو ترتیب سے پیش کرنا یا اس پر تحریری اظہار خیال کرنا مضمون کہلاتا ہے۔

مضمون کو عام طور سے تین اجزا میں تقسیم کیا جاتا ہے:

﴿۱﴾ **تمہید:**۔ جس میں متعلقہ موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے، اس کے متعلقات کا ذکر کیا جاتا ہے نیز اس کے بارے میں تعارفی گفتگو کی جاتی ہے۔ ﴿۲﴾ **نفس مضمون:**۔ اس حصے میں زیرِ نظر موضوع کی جملہ تفصیلات کا بیان مقصود ہوتا ہے۔ مضمون نگار مختلف دلائل وشواہد کی مدد سے اپنے نظریات کی حمایت میں ثبوت فراہم کرتا ہے اور قاری کو اپنے حق میں قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بہت اہم اور بنیادی حصہ ہوتا ہے۔ ﴿۳﴾ **خاتمہ:**۔ اس آخری حصے میں مضمون نگار اپنے ثبوت و دلائل کی روشنی میں نتائج اخذ کرنے کا کام کرتا ہے۔ یہی مضمون نگاری کا مقصد ہوتا ہے کیوں کہ اخذ نتائج ہی کسی مضمون کا ماحصل ہوتا ہے۔ دراصل یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں مضمون نگار تمہید اور نفس مضمون کے منازل سے گزرتا ہوا پہنچنے اور قاری کو لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔

موضوعات کے نقطۂ نظر سے مضمون کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ مضمون کی کامیابی کا راز اس کی ترتیب و تنظیم کے حسن میں پوشیدہ ہے۔ ایک اچھے مضمون میں موضوع یا مسئلے کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ زیرِ نظر موضوع کی جملہ جہات زیرِ بحث آجائیں۔ تمہیدی حصے میں موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے جس سے موضوع کی اہمیت کھل کر سامنے آتی ہے نیز اس کے مضمون نگار کی منشا بھی پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ منطقی جواز کے سہارے اہم اہم نکات روشن کیے جاتے ہیں اور اس کے مبہم گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا و ارتقا کے سلسلے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ بعض تنقید نگاروں نے دہلی کالج کے استاد ماسٹر رام چندر کو اور بعض دیگر نقادوں نے سرسید احمد خاں کو اردو مضمون نگار کا بانی تسلیم کیا ہے۔ تاریخی طور سے یہ بات مصدقہ ہے کہ اردو میں مضمون نگاری کا آغاز دہلی کالج کے ہفتہ وار رسالے ''قران السعدین'' سے ہوا ہے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الواس اشپرنگر نے ۱۸۴۵ء میں اس کا اجرا کیا تھا۔ طلبا کو کوئی عنوان دے دیا جاتا تھا اور اسی کے تحت وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔ اس طرح سے قلیل مدت میں ہی مختلف موضوعات یعنی سائنسی، ادبی، مذہبی اور تاریخی موضوعات پر غور و فکر اور اظہارِ خیال کی ایک روایت قائم ہوگئی۔

رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

> ''اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید احمد خاں سے ہوا۔ انہوں نے مذہبی، سیاسی، ادبی، علمی، معاشرتی، تاریخی، فلسفیانہ اور دیگر موضوعات پر بکثرت مضامین لکھ کر ہم عصر ادیبوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔''

ایک دوسری محقق سیدہ جعفر نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ ان کے مطابق سرسید احمد خاں اردو کے اولین مضمون نگار نہیں۔ ان کے بقول:

> ''مضمون نگاری کے ارتقا میں سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں۔ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی۔ رام چندر نے مضمون کے فارم کو خیالات اور جذبات کے اظہار کی سہولت بخش اور غیر رسمی ذریعۂ اظہار محسوس کرتے ہوئے اس صنف کو اپنایا تھا۔ سرسید احمد خاں کے مضامین اس ابتدا کا نکھرا ہوا اور ترقی یافتہ روپ ہیں۔''

لہٰذا انکار کی گنجائش نہیں کہ ماسٹر رام چندر اردو کے اولین مضمون نگار ہیں جنہوں نے انگریزی ادب کے زیر اثر مختلف موضوعات پر سب سے پہلے مختصر مضامین لکھنے کا آغاز کیا اور بعض انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ پیش کیا۔ گویا مضمون نگاری کے حوالہ سے ماسٹر رام چندر سرسید احمد خاں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن رام چندر کے مضامین ادبی لحاظ سے کوئی خاص وقعت نہیں رکھتے۔ ان کے مضامین میں وہ سلاست و روانی اور تازگی نہیں جو سرسید کے مضامین میں پائی جاتی ہے۔ رام چندر کے مضامین کی زبان ناپختہ ہے۔ انہوں نے انگریزی سے جو مضامین اُردو میں منتقل کیے وہ لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی ان خامیوں کی وجہ سے ان کی اولیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ زبان و بیان کی خامیوں کے باوجود وہی اردو کے پہلے مضمون نگار کہے جانے کے مستحق ہیں کیوں کہ اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا تھا۔

صورت حال یہ ہے کہ اگر مضامین کو ذیلی عناوین میں تقسیم کیا جائے تو بیسیوں ذیلی اقسام سامنے آئیں گی۔ اردو مضمون نگاری کے سرمایے میں موضوعاتی نقطۂ نظر سے بہت تنوع پایا جاتا ہے چنانچہ ادبی، تنقیدی، لسانیاتی، تحقیقی غرض ہر زاویے سے مضامین لکھے گئے ہیں اس طرح اردو مضمون نگاری کے سرمایے میں مستقل طور سے اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس طرح سے اگر موضوعات کی نوعیت اور مواد کی پیش کش کے اعتبار سے مضمون نگاری کی اقسام متعین کی جائیں تو اس ذیل میں تنقیدی، سماجی، تعلیمی، سیاسی، ادبی، سوانحی، تہذیبی و معاشرتی، سائنسی، علمی، تحقیقی، طنزیہ و مزاحیہ، رومانی وغیرہ اقسام شامل کی جاسکتی ہیں۔

اس طرح مختلف موضوعات پر ہزاروں کی تعداد میں مضامین لکھے گئے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان تمام مضامین کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ مضمون نگاری نے زندگی کے حقیقی مسائل کو زمین پر اتارا اور فکشن کے اس تصور کو باطل کر دیا جو غیر حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔ اس صنف نے نثر میں منطقی انداز، سائنسی نقطۂ نظر اور غیر جانب دارانہ شعور کی پرورش کی اور زندگی کی اصلی کہانیوں کو داستانوں کی مصنوعی اور تخیلاتی دنیا سے باہر نکالنے کا کام کیا۔ افراد میں مسائلِ کائنات کا حقیقی شعور پیدا کیا اور موضوعات میں رنگا رنگی کی فضا قائم کی۔ ان مضامین کے موضوعات شعر و ادب، تحقیق و تنقید، لسانیات، تاریخ ادب، سائنس و جغرافیہ، ادیان و مذاہب، سیاست و اقتصادیات غرض کہ سماجی اور مذہبی علوم کی جملہ شاخوں کا احاطہ کرتے تھے اس کے علاوہ دیگر علوم انسانی پر تبادلۂ خیال کی روایت پروان چڑھانے میں ان مضامین کا بہت ہی اہم کردار ہے۔

01.13 فرہنگ

ابلاغ : بات کا قاری تک پہنچنا

ادیان : دین کی جمع

افراد : فرد کی جمع انسان

خلط مبحث : معاملے کا الجھ جانا، معاملے کا خلط ملط ہو جانا

توسیع : پھیلاؤ

خامہ : قلم

خوشہ چیں : فائدہ اٹھانے والا

کمین گاہ : چھپنے کی جگہ

مافی الضمیر : جو کچھ دل میں ہے

مبہم : پوشیدہ، غیر واضح

متمول : ثروت مند یعنی مال دار

منعکس ہونا : جھلکنا، ظاہر ہونا

نفس مضمون : مضمون کا اصل حصہ

ہیئت : فارم، یعنی ادب کے اظہار کی دو ہیئتیں ہیں: نثر اور نظم

01.14 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ غیرافسانوی نثر سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر۲ مضمون اور مقالے کی شناخت متعین کیجیے۔

سوال نمبر۳ مضمون، مقالہ اور انشائیہ کا فرق واضح کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ مضمون کی اقسام کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر۲ مضمون نگاری کے موضوعات پر اظہار خیال کیجیے۔

سوال نمبر۳ مضمون نگاری کے سلسلے میں اردو رسائل کی خدمات کا ذکر کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : کس صنف کا تعلق غیرافسانوی نثر سے ہے؟

(الف) قصیدہ (ب) انشائیہ (ج) حمد (د) غزل

سوال نمبر۲ : مقالہ حجم کے اعتبار سے کیسا ہوتا ہے؟

(الف) بے مطلب (ب) بے کار (ج) مختصر (د) طویل

سوال نمبر۳ : کس کالج نے مضمون نگاری کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا؟

(الف) بدایوں کالج (ب) سینٹ جانس کالج، آگرہ (ج) دہلی کالج (د) بریلی کالج

سوال نمبر۴ : مضمون نگاری کی ابتدا کس نے کی؟

(الف) ماسٹر رام چندر (ب) میر اَمّن (ج) حیدر بخش حیدری (د) رشید احمد صدیقی

سوال نمبر۵ : اِن میں سے کون تنقیدی مضمون نگار ہے؟

(الف) مرزا غالبؔ (ب) احتشام حسین (ج) ابوالکلام آزادؔ (د) محمد حسین آزاد

سوال نمبر۶ : اِن میں سے کون تحقیقی مضمون نگار ہے؟

(الف) ماسٹر رام چندر (ب) سرسید احمد (ج) نذیر احمد (د) مولوی عبدالحق

سوال نمبر۷ : ''صنف'' کی جمع کیا ہے؟

(الف) اصناف (ب) صف (ج) صفوف (د) اصنف

سوال نمبر۸ : ''دلائل'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) دلالت (ب) مدلول (ج) دلیل (د) مدلل

سوال نمبر۹ : ''اہم'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) موہوم (ب) غیراہم (ج) وہم (د) اہمیت

سوال نمبر۱۰ : ''حجم'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) زیادتی (ب) ضخامت (ج) کمی (د) طولانی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ب) انشائیہ	جواب نمبر۶	: (د) مولوی عبدالحق
جواب نمبر۲	: (د) طویل	جواب نمبر۷	: (الف) اصناف
جواب نمبر۳	: (ج) دہلی کالج	جواب نمبر۸	: (ج) دلیل
جواب نمبر۴	: (الف) ماسٹر رام چندر	جواب نمبر۹	: (ب) غیراہم
جواب نمبر۵	: (ب) احتشام حسین	جواب نمبر۱۰	: (ب) ضخامت

1.15 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو اسیز از سید ظہیرالدین مدنی

۲۔ اردو میں انشائیہ نگاری از رفیع الدین ہاشمی

۳۔ اردو میں انشائیہ نگاری از بشیر سیفی

۴۔ اردو میں مضمون نگاری کا ارتقا از سیدہ جعفر

۵۔ تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی

۶۔ فن کار سے فن تک از ابوذر عثمانی

۷۔ ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ از سیدہ جعفر

اکائی 02 اردو کے اہم مضمون نگار

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد

02.02 : تمہید

02.03 : مختلف نثری اصناف سے مضمون کا امتیاز

02.04 : مضمون نگاری کی ابتدا

02.05 : مضمون نگاری کا ایک دوسرا رنگ

02.06 : اردو کا اولین مضمون نگار: ماسٹر رام چندر یا سرسید

02.07 : مضمون نگاری کے فروغ میں رفقائے سرسید کی خدمات

02.08 : مضمون نگاری کے فروغ میں رسائل وجرائد کی خدمات

02.09 : اردو کے اہم مضمون نگار

02.10 : خلاصہ

02.11 : فرہنگ

02.12 : سوالات

02.13 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے تحت ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ایک نثری صنف کی حیثیت سے مضمون نگاری کا دائرۂ کار کیا ہے؟ اس کی ابتداو ارتقا کا پس منظر کیا تھا؟ مضمون نگاری کی اوّلیت کا تاج کس کے سر باندھا جائے؟ مضمون نگاری مقالہ نگاری اور انشائیہ نگاری کے درمیان خط فاصل کن اصولوں کی بنیاد پر کھینچا جا سکتا ہے۔ یہ بھی جاننے کی کوشش ہوگی کہ اس نثری صنف کو بال وپر عطا کرنے میں کن اہل قلم کی مساعی شامل حال رہی ہیں؟ ان اہل قلم کی انفرادی خدمات کیا کیا ہیں؟ ان کی انفرادیت کن خوبیوں سے قائم ہوئی ہے نیز اردو رسائل وجرائد کی اشاعت نے مضمون نگاری کو کس طرح سے بامِ عروج پر پہنچایا تھا؟

02.02 تمہید

غیر افسانوی نثر میں جن اصنافِ نثری کی اہمیت ومقبولیت بہت زیادہ ہے ان میں مضمون نگاری کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ تاریخی طور سے یہ نثری صنف ۱۸۵۷ء کے بعد کے دَور کی دین کہی جا سکتی ہے۔ جب ہم تاریخ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ جدید اردو نثر کی توسیع کا زمانہ ہے۔ جدید نثری اصناف کے لئے اسی دور میں سازگار ماحول میسر ہوا تھا۔

۱۸۵۷ء سے قبل اردو نثر کے دامن میں چند نثری اصناف کے سرمایے کے سوا اور کوئی قابل ذکر سرمایہ موجود نہ تھا۔ ادبی اصناف میں داستانوں کا کافی ذخیرہ تھا۔ مرزا غالب نے خطوط نگاری کے میدان میں چند برس ہوئے قدم رکھا تھا۔ اگر مولانا حالی کی بات تسلیم کر لی جائے تو ۱۸۵۰ء کے آس پاس مرزا غالب نے اس صنف کی طرف باقاعدہ توجہ کی تھی اسی زمانے میں ان کے خطوط ضبط تحریر میں آئے تھے۔ ان خطوط کی ادبی، تاریخی اور تہذیبی حیثیت ہے۔ غالب اس صنف کے بانی تو نہیں تھے لیکن ایک خاص اسلوب کے بنیاد گزار لازمی طور سے تھے اور ان ہی کی خدمات کی بدولت خطوط نگاری ادبی صنف کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔

نثری سرمایے میں مذہبی نثر کا سرمایہ بھی تنوع پیدا کر رہا تھا اس کے باوجود جدید نثری اصناف کی دولت سے نثر کا دامن خالی تھا۔ ان حالات میں اُردو کا پہلا ناول ڈپٹی نذیر احمد نے مرأۃ العروس کے نام سے ۱۸۶۹ء میں تصنیف کیا تھا۔ دراصل اس سانحہ کے بعد کا دور بیداری کا دور ہے۔ بیداری کی اس لہر کو پیدا کرنے میں دہلی کالج کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کالج کے اساتذہ وطلبا نے ہندوستان میں عام بیداری پیدا کرنے کی سمت میں بہت مثبت کردار ادا کیا تھا۔ کتابوں کی تصنیف و تالیف سے ترجمہ تک اس کی خدمات نے دھوم مچائی تھی۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی خدمات کا بھی اعتراف ضروری ہے کہ حالات کے تقاضوں کے مدنظر جدید نثری اصناف کے فروغ میں ان لوگوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سوانح نگاری، تنقید نگاری، مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، ناول نگاری؛ غرض کہ ہر صنف کی پشت پر سرسید اور رفقائے سرسید کی خدمات کے نشانات موجود ہیں۔ مضمون نگاری کی صنف کو بھی اسی جماعت نے بامِ عروج پر پہنچایا تھا۔

02.03 مختلف نثری اصناف سے مضمون کا امتیاز

مضمون کی تعریف کرتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا ہے:

> ''کسی متعین موضوع پر اپنے خیالات اور جذبات واحساسات کا تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ دنیا کے ہر معاملے، مسئلے یا موضوع پر مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ مضمون کی بالعموم ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے زیر بحث مسئلے کا تعارف کرایا جاتا ہے پھر اس کی حمایت یا مخالفت میں دلائل دیے جاتے ہیں اور آخر میں نتیجہ پیش کیا جاتا ہے۔ بعض مضامین تاثراتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایسی ترتیب اور دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ مضمون کے لئے نظم وضبط اور توازن و تناسب ضروری ہے۔''

مقالہ کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

> ''مقالہ عام طور پر سنجیدہ موضوعات پر لکھا جاتا ہے۔ اس کے اقسام موضوعات کی بنیاد پر طے کرنا زیادہ مناسب ہوگا، ضخامت یا اختصار کی بنیاد پر نہیں۔ عام طور سے مضمون یا انشائیہ دو چار صفحات سے لے کر دس بیس صفحات تک پھیلا ہوتا ہے۔ بعض مضامین کا حجم اس سے قدرے زیادہ بھی ہو سکتا ہے لیکن مقالہ ایسی کسی پابندی کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ چالیس پچاس صفحات سے شروع ہو کر ہزار صفحات تک پھیلایا جا سکتا ہے۔ شبلی کے مقالات مختصر مقالات کی فہرست میں آئیں گے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے اس حد بندی کے دوسرے کنارے پر ہیں۔''

ایک مقبول نثری صنف انشائیہ کے بنیادی خدوخال یوں ہو سکتے ہیں:

''انشائیہ وہ صنف نثر ہے جس میں ذاتی تاثرات اور تجربات بے تکلفی اور اختصار کے ساتھ پیش کر دیے جائیں۔ اس کا طرز غیر رسمی طریق کار کا مالک ہو۔ اس کا اسلوب شگفتہ اور حسین ہو۔ ساتھ ہی ساتھ انشائیہ نگار اس انشائیہ کو مکمل نہ کرے بلکہ ایک ادھورے پن کا احساس باقی رہ جائے اور موضوع کے حوالے سے ذہن میں در آنے والی دیگر باتوں کا بھی ذکر کرے، تاہم موضوع سے انحراف نہ کرے اور کسی حتمی نقطہ یا فیصلہ تک خود نہ پہنچے۔ اس میں کوئی مرکزی خیال نہ ہو اور نہ ہی سنجیدگی کا عنصر پایا جائے۔ البتہ خاص زور طرزِ تحریر پر ہو اور اس میں قلم کار کو دوسری اصناف کی بہ نسبت زیادہ آسانیاں اور آزادیاں حاصل ہوں۔ انشائیہ طوالت کا بار برداشت نہیں کر سکتا۔ جتنے بھی بہترین انشائیے ہیں وہ اختصار کی خوبی کے حامل ہیں۔ انشائیہ میں ہمیشہ ہی اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ اس کا نقطۂ نظر ذاتی اور شخصی ہوتا ہے۔

ان مختلف تعریفات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض نثری اصناف کے خدوخال ظاہری طور سے ایک دوسرے کے متوازی نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے ان تین نثری اصناف کو لے کر اچھا خاصا خلط مبحث ہے۔ چنانچہ یہ ضروری معلوم ہوا کہ مذکورہ نثری اصناف کے خدو خال کو نمایاں کر دیا جائے تا کہ ایک عام قاری اس نازک فرق سے بخوبی واقف ہو سکے۔

02.04 مضمون نگاری کی ابتدا

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز دہلی کالج کے ہفتہ وار رسالے ''قران السعدین'' سے ہوتا ہے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الواس اشپرنگر نے ۱۸۴۵ء میں اس کا اجرا کیا تھا۔ دہلی کالج کے امتحان میں ایک پرچہ مضمون نگاری کا ہوا کرتا تھا۔ طلبا کو کوئی عنوان دے دیا جاتا تھا اور اسی کے تحت وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔ بہترین مضمون نگار کو تمغے دیے جاتے تھے۔ یہ باتصویر اخبار تھا جس میں علمی، سائنسی اور ادبی مضامین ہوتے تھے۔ کالج کی روداد اور تقریری مقابلوں کی روداد اس اخبار میں شائع ہوتی تھی۔ یہ رسالہ انگریزی طرز پر نکالا گیا تھا۔ اس طرح سائنسی موضوعات پر مضامین نویسی کا سلسلہ قران السعدین سے شروع ہوا اور بہت قلیل مدت میں مختلف موضوعات یعنی سائنسی، ادبی، مذہبی اور تاریخی موضوعات پر غور و فکر اور اظہارِ خیال کی ایک روایت قائم ہو گئی۔

02.05 مضمون نگاری کا ایک دوسرا رنگ

سرسید کی مقصدی اور اصلاحی نثر کے مقابلے میں رومانوی رجحانات کا دور شروع ہوتا ہے جس میں عقلیت پسندی کے بجائے جذبہ و خیال اور احساس کی شدت پر زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے۔ رومانوی نثر نگاروں میں عبدالحلیم شرر کا نام بہت نمایاں ہے۔ اپنے رسالے ''دل گداز'' کی مدد سے انہوں نے رومانوی اور تخیلاتی نثر کو فروغ بخشا۔ شرر کے بعد سجاد حیدر یلدرم اور ''مخزن'' کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور رومانوی نثر نگاروں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جس نے سرسید کی صریح مقصدیت اور راست اندازِ بیان کے مقابلہ میں تخیلاتی اور استعاراتی نثر کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ سجاد انصاری، خلیقی دہلوی، امتیاز علی تاج، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھ پوری اس نثری انداز کے اہم نثر نگار کے روپ میں سامنے آئے۔ اسی نثر کا ایک اہم موڑ ابوالکلام آزاد کے رسائل ''الہلال اور البلاغ''

ہیں جنہوں نے رومانیت کا ایک نیا معیار قائم کیا اور شدت جذبات اور تخیل کی فراوانی کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ علمیت اور خطابت ان کی نثر کا خاصہ ہے۔ میر ناصر علی صرف اپنی مضمون نگاری کی قوت کے بل پر تاریخ ادب میں زندہ ہیں۔ انہوں نے با قاعدہ کوئی کتاب تصنیف نہیں کی لیکن اپنے اعلیٰ ادبی مذاق کی بدولت اور حسین نثر کی وجہ سے وہ ادب میں یاد کیے جاتے ہیں۔ وہ کئی رسالوں کے ایڈیٹر تھے۔ ایک زمانے میں ''صلائے عام'' اردو کا بہت مشہور و مقبول رسالہ تھا میر ناصر علی اسی کے ایڈیٹر تھے۔ اس سے قبل وہ ''تیرھویں صدی اور زمانہ'' نام کے پرچے نکال چکے تھے۔ ان اخبارات و رسائل کے وسیلے سے انہوں نے پاکیزہ خیالات، درست زبان اور دل کش اسلوب کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ ان کے رسالے ''صلائے عام'' کی ایک زمانے میں بڑی دھوم مچی تھی۔ میر ناصر علی کا اسلوب ایسا اسلوب ہے جسے ہم نثر میں شاعری کا اسلوب قرار دے سکتے ہیں۔

مضمون نگاری میں دوسرا رنگ اودھ پنچ ۱۸۷۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ اردو مضمون نگاری کی تاریخ میں ''اودھ پنچ'' کی خدمات اہم ہیں۔ منشی سجاد حسین کی ادارت میں شائع ہونے والے اس رسالے نے اردو مضمون، طنز و ظرافت اور نثر نگاری کو ایک نئی راہ پر لگا دیا۔ ہلکے پھلکے اور طنزیہ مضامین کی بدولت اس رسالے نے خوب شہرت حاصل کی۔ فقروں کی کاٹ، ادبی چاشنی، زبان کی مہارت اور واقعات کی منظر کشی نے اودھ پنچ کو اس دور کا سب سے مقبول رسالہ بنا دیا۔ اودھ پنچ اپنے معاصر مسائل سے گہری واقفیت رکھتا تھا۔ اس کا مقابلہ اس دور کے کم اخبار کر سکتے تھے۔ یہ نئے خیالات، نئے احساسات، حکومت مخالف بیداری، طنزیہ مزاحیہ اسلوب کی بدولت بہت جلد شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ اس میں ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جو اپنے معاصر زندگی کی تہذیبی اور سیاسی احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتے تھے۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کے گرد ہم خیال اور ہم مذاق افراد کا ایک حلقہ بن گیا تھا جس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اس رسالے کو آسمان پر پہنچا دیا۔

اس رسالے میں بعض طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے، لیکن جب اس رسالے میں پھکڑ پن اور رکاکت کی گرم بازاری ہونے لگی تو سنجیدہ حلقوں میں اس کی مقبولیت پر فرق پڑنے لگا۔ دورِ اودھ پنچ میں دو اہم مضمون نگار گزرے ہیں ایک چکبستؔ جن کے مضامین کا مجموعہ مضامین چکبست کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور دوسرے مولانا عبدالحلیم شرر ہیں۔ شرر میں ادبی صلاحیتیں بہت تھیں چنانچہ انہوں نے اپنے رسالے دلگداز کی بدولت اردو مضمون نگاری کو نئی بلندیوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو میں رومانوی مضمون نگاروں میں مہدی افادی کا نام بہت اہم ہے۔ وہ ایک صاحب طرز نثر نگار تھے اور بعض بنیادی خوبیوں کی بدولت امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ مہدی ایک ذہین انسان تھے اور غور و فکر کے عادی تھے۔ وہ ادب کا بہت شائستہ اور شستہ مذاق رکھتے تھے۔ ان کی رومانیت پسندی کی ہی دین تھی کہ انہوں نے بہت سارے انگریزی الفاظ کے اردو ترجمے کیے۔ کلاسیکی ادب کے لئے انہوں نے ادب العالیہ کی اصطلاح وضع کی۔ مہدی قدیم سے بیزار اور جدید کے پرستار تھے۔ وہ اپنی تحریروں میں ادب برائے ادب کے نظریے کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ وہ رومانیت پر اصرار کرنے کے ساتھ ہی عقلیت پر زور دیتے تھے۔ ان کی شخصیت انھی دو متضاد عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔ وہ رنگین اور رومانی نثر نگاروں میں اپنی خاص شناخت رکھتے ہیں۔ عبدالماجد دریابادی بھی ایک منفرد مضمون نگار ہیں جن کے مضامین اور تحریروں میں طنز کی چبھن کے ساتھ ایک خاص قسم کی رقت آلود کیفیت اور تھم تھم کر وار کرنے کا انداز ملتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے اسلوب پر ان کے استاد مولانا شبلی کا گہرا اثر ہے۔ اسی لئے ان کے مضامین میں بھی اعلیٰ قسم کی شگفتگی اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔ نیاز فتح پوری کے مضامین تاثراتی تنقید کے زمرے میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے ہاں حسن کی تلاش اور فطرت کے حسن کا مطالعہ بنیادی وصف بن کر اُبھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں ادبیت کی چاشنی بھرپور ملتی ہے۔

02.06 اردو کا اولین مضمون نگار: ماسٹر رام چندر یا سرسید

ایک صنف کی حیثیت سے مضمون نگاری علی گڑھ تحریک کی دین کہی جاتی ہے لیکن اس مسئلے میں جزوی صداقت ہے۔ علی گڑھ تحریک کے وجود پذیر ہونے سے بہت برس پہلے جب دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا تھا تو اس کالج کی طرف سے رسائل بھی جاری کیے گئے تھے اور ان رسائل کے اجرا میں دہلی کالج کے ہی ایک استاد ماسٹر رام چندر کا کردار بہت اہم رہا تھا۔ انہوں نے قران السعدین نامی رسالے سے مضمون نگاری کا آغاز کیا تھا اس لئے ہمیں بھی اردو مضمون نگاری کی ابتدا ماسٹر رام چندر ہی سے تسلیم کرنا چاہیے۔ یہ بات معلوم ہے کہ انگریزوں کے اس ملک پر تسلط حاصل کرنے کی وجہ سے ہندوستانیوں کی غلامی کی سیاہی کا رنگ مزید گہرا ہو گیا تھا لیکن اس انقلابِ دہر کے بعض تاریخی اور سماجی فائدے بھی ہندوستانیوں کی زندگی پر مرتب ہوئے تھے جن کی وجہ سے ہندوستانیوں نے ترقی کی نئی نئی منزلیں طے کیں۔ پریس کا نظام قائم ہونے کی وجہ سے ابلاغ و ترسیل میں سہولت پیدا ہوئی۔ علم و تعلیم کے میدان میں ترقی کے نئے دروازے کھلنے لگے۔

اخبارات و رسائل کے اجرا کی راہیں ہموار ہوئیں اور ان سب نے مل کر ہندوستانیوں کے اندر بیداری کا جذبہ پیدا کیا۔ ان میں تعلیم کے تئیں اور اپنے حقوق کے تئیں بیداری کی ایک ایسی لہر پیدا ہونے لگی جس نے ہندوستان کی قومی زندگی کے دھارے کو آزادی کی راہ پر لگانے کا کام کیا۔ اس طرح اردو مضمون نگاری نے رفتہ رفتہ قارئین کے ذہنوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ نئی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے لگے اور افکار و خیالات کی ایک ایسی کہکشاں بنانے میں کامیاب ہوئے جس نے ذہن انسانی کی تربیت میں بڑا مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مضمون نگاری میں اولیت کا سہرا سرسید کے سر نہیں بلکہ دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر کے سر بندھے گا۔

پروفیسر سیدہ جعفر نے پہلا مضمون نگار ماسٹر رام چندر کو قرار دیا ہے، وہ لکھتی ہیں:

> ''مضمون نگاری کے ارتقا میں سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں۔ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔''

ایک مقام پر مزید لکھتی ہیں:

> ''رام چندر پہلے ادیب ہیں جنہوں نے انگریزی ادب سے متاثر ہو کر انگریزی کے طرز پر مضامین لکھنے کی کوشش کی ،انہوں نے کئی انگریزی مضامین کا ترجمہ بھی کیا اور متعدد موضوعات پر انگریزی انشا پردازوں کے طرز پر مضامین لکھنے کی کوشش کی۔''

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی بھی رام چندر کی اولیت کے قائل ہیں، لکھتے ہیں:

> ''اردو نثر کی تاریخ میں رام چندر کی اولیت اور قدامت مسلّم ہے کہ انہوں نے علمی، تاریخی، معاشرتی اور سائنسی موضوعات پر سب سے پہلے مختصر مقالات (Essays) لکھے۔''

لیکن علماے ادب کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو سرسید کو اردو انشائیہ کا موجد سمجھتا ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''اردو میں مضمون نگاری کے بانی سرسید ہی تھے۔ ادب کی یہ صنف جس کا انگریزی نام Essay ہے، یورپ ہی سے حاصل کی گئی ہے۔''

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا کہنا ہے:

''اردو ادبیات میں مضمون نگاری انگریزی ادبیات کے زیر اثر انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور سرسید احمد خاں اردو میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز کرنے والے تھے۔''

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

''اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید سے ہوا۔انہوں نے مذہبی، سیاسی، ادبی، علمی، معاشرتی اور دیگر موضوعات پر بکثرت مضامین لکھ کر ہم عصر ادیبوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔''

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہوا کہ ماسٹر رام چندر سرسید کے پیش رَو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات تاریخی لحاظ سے درست ہوسکتی ہے لیکن رام چندر کے مضامین ادبی لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ان کے مضامین میں وہ سلاست، روانی نہیں جو سرسید کا خاصہ ہے۔ رام چندر کی زبان ناپختہ ہے۔انہوں نے جو مضامین انگریزی سے نقل کیے ہیں وہ خالص ترجمے معلوم ہوتے ہیں۔

بقول غلام حسین ذوالفقار:

''رام چندر کے ان مضامین کو ہم باقاعدہ ادبی مضمون نہیں کہہ سکتے زیادہ سے زیادہ انہیں بے قاعدہ مضامین کی صف میں شمار کیا جاسکتا ہے۔''

02.07 مضمون نگاری کے فروغ میں رفقائے سرسید کی خدمات

یہاں ان رفیقوں کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کیوں کہ انھی رفیقوں نے سرسید کی ایما پر اردو نثر نگاری کے میدان میں اچھا خاصا یادگار ذخیرہ چھوڑا ہے۔ یہ وہ احباب تھے جنہوں نے سرسید کے دوش بدوش رہ کر زبان وادب، تعلیم وتربیت اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کے قریبی احباب میں مولانا حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، وقارالملک، مولوی چراغ علی اور مولوی ذکاءاللہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

﴿۱﴾ الطاف حسین حالؔی:۔

حالی کی نثر نگاری کے حوالے سے اگر ان کے مضامین پر گفتگو کی جائے تو مضامین حالی، کلیات نثر حالی جلد اول وجلد دوم میں حالی کے مضامین کو محمد اسماعیل پانی پتی نے یکجا کر دیا ہے۔ان مضامین کی روشنی میں حالی کو کسی ایک مخصوص قسم کے مضامین تک محدود نہیں رکھا جاسکتا، انہوں نے سوانحی، اخلاقی، مذہبی اور تاریخی قسم کے مضامین میں زور طبع دکھایا ہے۔ان مضامین پر سرسید کا عکس موجود ہے، نیز خلوص، صداقت، ہم دردی، سادگی اور سلاست کی خوبیاں جو حالی سے منسوب ہیں ان مضامین میں بھی نظر آتی ہیں۔ان کا ایک اہم مضمون ''کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں'' اصلاحی نوعیت کا ہے اور خلوص وہم دردی، سوز مندی اور درمندی کی عمدہ مثال ہے۔حالی کے مضامین میں اصلاحی، ادبی اور سوانحی قسم کے مضامین شامل ہیں۔حالی کی دردمندی اور خلوص ان کی تحریروں میں اثر اور سوز پیدا کر دیتا ہے۔سادگی اور سلاست ان کی تحریر کا خاصہ ہیں۔ان کی تحریروں میں قوم کی اصلاح کا دردمند جذبہ ہمیشہ اور ہر مقام پر موجود رہتا ہے۔

حالی کا مضمون 'زبانِ گویا' میں اسلوب کی شگفتگی تو موجود ہے مگر براہِ راست انداز اور مقصدیت نمایاں ہے۔ حالی کا یہ واحد مضمون ہے جو ادبی شان لیے ہوئے ہے اس کے علاوہ ان کے باقی مضامین براہِ راست مدعا نگاری اور مقصدیت کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ حالی کے مضامین درحقیقت خیالاتِ سرسید کی صدائے بازگشت ہیں۔ یہ ایک علاحدہ موضوع ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ حالی نے سرسید کے اثرات بہت ہی خلوص اور دردمندی سے قبول کیے تھے اور ان کے اسلوب سے قریب تر ہی انداز میں اپنی باتیں کہتے تھے۔ سادگی، سنجیدگی، خلوص، صداقت اور منطقی استدلال جیسے محاسن حالی کے مضامین کا نقطۂ امتیاز ہیں۔ حالی کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کی نثر کسی مقام پر جذباتی نہیں ہونے پاتی، سنجیدگی اور متانت اور سادگی کے عناصر سے وہ اپنی نثر کی دوکان سجاتے ہیں۔

﴿۲﴾ محمد حسین آزاد:۔

محمد حسین آزاد کی نثر میں حسن و جمال کی جلوہ آرائی ہے۔ وہ رنگین اور مرصع نثر لکھتے ہیں اور تشبیہات و استعارات کی مدد سے نثر کو حسین، دل کش اور مقناطیسی قوت سے بھر دیتے ہیں۔ خیال کی دل کشی اور زبان کی خوب صورتی کی وجہ سے آزاد کے مضامین دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' میں ان کی قوتِ پرواز کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوتا ہے۔ ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' میں انہوں نے تخیل کی بلند پروازی اور ڈرامائیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انسانی کمزوریوں اور نفسیات کا عمدہ انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے۔

محمد حسین آزاد کے مضامین میں حسن و جمال کی مرقع نگاری نظر آتی ہے جس کی وجہ سے زبان کا حسن اور تشبیہ و استعارے کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ خیال کی دل کشی اور بیان کی خوبی کی بدولت آزاد کے مضامین اپنی معنویت رکھتے ہیں۔ نیرنگ خیال میں انہوں نے جو مضامین لکھے ہیں وہ فکر و خیال اور اندازِ بیان کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ یہ مضامین دراصل حقیقی انشا پردازی کی عمدہ مثال بھی ہیں۔ آزاد کا مقصد بھی اصلاحی ہے لیکن انہوں نے اصلاح کے لئے سرسید کے براہِ راست اسلوب کے بجائے رنگین اور دل چسپ انداز اختیار کیا جس نے ان کی تحریر میں جادو کا اثر پیدا کر دیا ہے۔ ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' یہ مضمون معاشرتی اصلاح کا رنگ لیے ہوئے ہے لیکن اندازِ بیان کی خوبی نے اسے خشک اور بدمزہ ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔

﴿۳﴾ شبلی نعمانی:۔

شبلی کی شناخت منفرد ہے۔ رفقائے سرسید میں وہ سب سے کم عمر تھے لیکن ان کی خدمات کی جہات مختلف تھیں۔ مفکر، عالم، مورخ، مصلح، سوانح نگار، سیرت نگار، عالم فلسفہ و کلام؛ غرض وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اعتدال اور استدلال کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی نثر میں ایک خاص حسن موجود ہے جو فلسفہ اور علم کلام کے مباحث کو بھی خشک ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ تاریخ اور بالخصوص اسلامی تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ تاریخی واقعات سے استدلال کرتے ہوئے اپنے مضمون کے لئے سنگ وخشت فراہم کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان پختہ کار اور عالمانہ ہے لیکن دل کش اور رنگین ہے۔ شبلی اپنے اسلوب میں رنگینی تاریخی واقعات اور زبان و بیان کی خوبیوں سے پیدا کرتے ہیں۔ شبلی نعمانی کے مضامین تاریخی اور ادبی نوعیت کے ہیں۔ شبلی تاریخ کی مدد سے اپنی نثر میں ایک رومانوی انداز پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ زبان و بیان کی خوبی اور علم بلاغت کے جملہ محاسن سے وہ اپنی نثر کو خوب صورت بناتے ہیں۔ تخیل اور فکر کی کارفرمائی کے علاوہ ان کے مضامین میں جوش و جذبات سے آراستہ سحر انگیز نثر سامنے آتی ہے۔

علمی بصیرت اور حسن کلام سے ان کے مضامین کی اہمیت باقی رہے گی۔ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ شبلی کے مضامین کا اسلوب ہمیشہ یکساں نہیں ہے۔مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے ان کا اسلوب بھی تبدیل ہوتا رہا ہے۔مثال کے طور پر مغربی مفکرین کے اعتراضات کا جواب وہ پر جوش، توانا اور گرم اسلوب میں دیتے ہیں۔تاریخی مضامین میں سنجیدگی اور تاریخی حقائق پیش کرتے وقت وہ ایک محقق کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ان کا ایک خاص انداز ایجاز واختصار کا ہے جو ان کی نثر کو بلاغت کے حسن سے معمور کر دیتا ہے۔

﴿۴﴾نواب محسن الملک:۔

نواب محسن الملک کی ادبی صلاحیتوں کا قابل قدر ذخیرہ مذہب اور قانون کی نذر ہو گیا۔انہوں نے تہذیب الاخلاق کے لئے جو مضامین لکھے وہ سنجیدہ مضامین کے زمرے میں آتے ہیں۔نواب وقار الملک کے مضامین کو موضوع اور مواد کے لحاظ سے مذہبی اور سیاسی کہنا چاہیے۔مولوی چراغ علی کی صلاحیتیں بھی مذہبی موضوعات پر خامہ فرسائی میں صرف ہوئیں۔محسن الملک ملک وملت کے حالات سے بے خبر نہیں تھے جب ملک میں سودیشی تحریک زور پکڑنے لگی تو انہوں نے سودیشی تحریک کے نام سے ایک مضمون بھی لکھا تھا۔وہ اس امر میں سرسید کے پوری طرح ہم نوا تھے کہ نئے علوم مذہب کی راہ میں کس طرح بھی حائل نہیں ہیں۔مذہب کو ان علوم سے کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔محسن الملک نے جو باتیں بھی اپنے مضامین میں کہی ہیں ان میں عقلیت اور توازن کی صفات مکمل طور سے موجود ہیں۔ان کے طرز تحریر میں جوش اور روانی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔مولانا شبلی نعمانی نے محسن الملک کے اسلوب بیان کی تعریف کی ہے۔

﴿۵﴾مولوی ذکاء اللہ:۔

مولوی ذکاء اللہ دہلی کالج کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے۔ادب کے علاوہ ان کی دل چسپی کا خاص میدان ریاضی اور دیگر سماجی علوم تھے۔ان موضوعات پر انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور شمس العلما کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔مختلف رسالوں اور اخبارات میں انہوں نے بہت سارے مضامین لکھے۔چوں کہ ان کی طبیعت میں غور وفکر اور تحقیق وتدقیق کا مادہ فطری طور سے غالب تھا اس لئے ان کے مضامین میں سنجیدگی کے عناصر زیادہ نظر آتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا اسلوب بیان بھی بعض اوقات پیچیدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

﴿۶﴾وقار الملک:۔

وقار الملک نے سرسید کے دوش بدوش رہ کر ادبی وعلمی خدمات انجام دیں۔ان کے مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہوتے تھے۔انہوں نے معاصر زندگی کے مسائل کو اپنی مضمون نگاری کے لئے منتخب کیا اور بڑی بے باکی اور بے خوفی سے حکومت کو بیدار کرنے کے لئے طنز آمیز مضامین لکھے۔انہوں نے ان مضامین میں حکومت کی غلط پالیسیوں پر سخت تنقید کیں۔عام تاثر یہ ہے کہ ان کے مضامین کی بدولت عام مسلمانوں میں بیداری، جوش کی کیفیت پیدا ہوئی اور سیاسی خیالات میں زبردست انقلاب پیدا ہوا۔زمانے کے تقاضوں کے تحت ان کا اسلوب بھی سادہ وسلیس تھا۔عربی فارسی کے مشکل الفاظ ان کے مضامین میں کم سے کم ملتے ہیں۔اس طرح ان کی تحریروں نے بھی مضمون نگاری کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

﴿۷﴾مولوی چراغ علی:۔

مولوی چراغ علی نے بھی مضمون نگاری کی صنف کو ترقی پذیر بنانے میں خدمات انجام دیں۔ان کی تصانیف پر مذہب کا گہرا رنگ

موجود ہے۔عیسائی مشنریاں جس طرح سے ہندوستانی معاشرے کی روایات پر حملہ آور تھیں، مولوی چراغ علی کے مضامین نے ان پر بند باندھنے کی کامیاب کوشش کی۔انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ نہ صرف مذہب کا دفاع کیا بلکہ اس امر کو بھی ثابت کر دکھایا کہ اسلام دنیوی منفعتوں کا مخالف نہیں ہے۔انہوں نے بہت سی قرآنی آیات کو تفسیروں کے روایتی انداز سے ہٹ کر عقل اور تاریخ کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔مولوی چراغ علی کا طرز بیان سادہ و سلیس ہے، نیز انہوں نے اپنے مضامین میں تعقل پسندی کا انداز اختیار کیا ہے اور مصنوعی اسلوب اور آرائشی زبان سے احتراز کیا ہے۔

02.08 مضمون نگاری کے فروغ میں رسائل وجرائد کی خدمات

بیسویں صدی کے اوائل سے ہی رسائل وجرائد کی اشاعت کی بدولت اردو مضمون نگاری نے تیز رفتاری سے ترقی کی راہ اختیار کی تھی اور اس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہاں مختصر سے مضمون میں سبھی رسائل کا احاطہ کرنا مقصود بھی نہیں ہے اور ممکن بھی نہیں لیکن چند ایسے رسائل کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کی بدولت نہ صرف مضمون نگاری کے دائرے میں وسعت پیدا ہوئی بلکہ بہت سارے ایسے قلم کاروں کی بھی شناخت قائم ہوئی جنہوں نے اس صنف نثر میں طبع آزمائی کی تھی۔رسائل وجرائد نے ایک طرف زبان وادب کے دائرے کو وسیع کیا تو دوسری طرف قلم کاروں اور مضمون نگاروں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنے کا کام بھی کیا کہ بہ صورت دیگر یہ کام ممکن نظر نہیں آتا۔

جن رسائل نے ادبی نثر کی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کیا ہے ان میں لاہور کا ''مخزن'' بہت قابل ذکر ہے۔اس کے ایڈیٹر سر عبدالقادر تھے۔مخزن کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک طرف روایات کی پاس داری کا لحاظ بھی رکھا اور دوسری طرف نئی قدروں کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا۔مخزن سے قبل اس صورت میں رسالے شائع نہیں ہوتے تھے۔یہ مخزن کا کارنامہ تھا کہ اس نے رسالے کی حیثیت سے نہ صرف خود کو مستحکم کیا بلکہ ایک ایسی شان دار روایت کی داغ بیل ڈالی کہ آج تک مضمون نگاری کے تعلق سے وہی راہ شاہراہ بنی ہوئی ہے۔مخزن کی اہمیت کا اندازہ صرف اس کے قلم کاروں کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے جن میں عبدالقادر کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، امتیاز علی تاج، مولانا غلام رسول، حفیظ جالندھری، شیخ محمد اکرام، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، راشد الخیری، عبدالحلیم شرر جیسے مستند اساطین ادب کے نام نامی شامل ہیں۔

ایک اور رسالہ ''زمانہ'' کان پور سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔بعد میں اس کی ادارت منشی دیانرائن نگم کے ہاتھوں میں آگئی اور اس رسالے نے زبردست ترقی کی۔زمانہ نے مختلف علمی، سائنسی اور تنقیدی مضامین معیاری نثر میں شائع کیے اور اعلیٰ نثر کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا جس کی وجہ سے بعد کے رسائل نے بھی وہی راہ اختیار کی اور بالآخر معیاری نثر میں بہت سارے رسائل سامنے آئے۔اس کے قلم کاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، شبلی، نوبت رائے نظر، چکبست، نواب جعفر علی خاں اثر جیسے لوگ تھے۔بعد کی نسل میں حامد اللہ افسر، علی عباس حسینی، وقار عظیم اور احتشام حسین نے اس رسالے کے لئے مضامین قلم بند کیے۔زمانہ کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لسانی تحقیق اور اردو زبان کے تعلق سے بہت مفید اور کارآمد مضامین اپنے قلم کاروں سے لکھوائے اور انہیں شائع کیا۔پریم چند بھی اس رسالے کے بڑے اہم قلم کار تھے۔

حسرت موہانی کا ''اردوئے معلیٰ'' بھی جو علی گڑھ سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔مضمون نگاری کی تاریخ میں علاحدہ مقام رکھتا ہے۔ اس میں سوانحی، تاریخی اور علمی وادبی مضامین ہوتے تھے۔نیز اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ مضامین بہت خشک بھی نہ ہوں اور بہت ہلکے بھی

نہ ہوں۔ ہر طبقے کے باذوق قارئین کے لئے اس میں تفریح کا سامان موجود رہتا تھا۔ زبان کے اصولوں کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ حسرت چوں کہ مجاہد آزادی بھی تھے اور اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں ان کا مقدر بن گئی تھیں، ان نازک حالات میں بھی انہوں نے اردوئے معلیٰ کا چراغ روشن رکھا اور بطور عموم اس کا باغیانہ لہجہ اخیر تک باقی رکھا۔ اردوئے معلیٰ کے صفحات پر جن اصحاب قلم کے نقوش مرتسم ہیں ان میں حسرت موہانی، مولوی ذکاءاللہ، چکبست، اسلم جیراج پوری، سید حیدر طباطبائی، احسن مارہروی اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی صحافت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دینے کی وجہ سے تاریخ ادب میں یاد کیے جائیں گے۔ ''الہلال اور البلاغ'' صحافت کی دنیا کے روشن ستارے ہیں۔ بنیادی طور پر مولانا کا ذہن رومانوی تھا۔ جوش، دل فریبی اور رنگینی ان کی نثر کا خاصہ ہے۔ پرشکوہ الفاظ اور گھن گرج کا لہجہ ان کی نثر کو خطابت سے قریب تر کر دیتا ہے۔ مولانا ایک خاص قسم کے احساسِ تفاخر سے دوچار تھے اور برتری کا یہ جذبہ ان کی تحریروں میں بار بار نظر آتا ہے۔ وہ عوام کو ایک مخصوص فاصلے سے مخاطب کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے لہجے میں ایک پیغمبرانہ شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے مضامین میں علم و اجتہاد، کتاب و سنت، تاریخ و فلسفہ، ادبیات عالم؛ غرض کہ ان کی مضمون نگاری علم کا ایک نگار خانہ ہوتا ہے۔ مولانا اپنے طرز کے خود ہی موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ان کے اسلوب کی تقلید بہتوں نے کی لیکن کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا۔ ان کے مضامین کے مجموعے: مضامین آزاد، انتخابات الہلال اور تصریحات آزاد ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اعظم گڑھ سے ایک رسالے کا اجرا ۱۹۱۶ء میں کیا تھا۔ اس کا نام ''معارف'' تھا۔ معارف نے اسلامی عقائد کو عقل کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی، نیز علوم قدیمہ کو جدید طرز پر مرتب کرنے کی حکمت عملی اپنائی۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ نگاری کا کام کیا۔ تحقیق کے میدان میں معارف کی خدمات بہت وقیع ہیں۔ ان مضامین کی یہ خاصیت آج تک باقی ہے کہ اس میں ادبی شان کے ساتھ ساتھ مذہبی شان بھی مساویانہ طور سے جلوہ گر رہتی ہے۔ گویا معارف ایک ایسی تحریک کے طور پر اپنی خدمات انجام دے رہا ہے جہاں روایات کا احترام بھی ہے اور نئے زمانے کا استقبال بھی؛ ظاہر ہے دبستان شبلی کے اس رسالے کے قلم کاروں میں وہ تمام اصحاب قلم شامل ہیں جو دبستان شبلی کے پروردہ تھے۔ ان قلم کاروں نے کسی نہ کسی طرح اپنا رشتہ اس ادبی جریدے سے ہمیشہ استوار رکھا۔

انجمن ترقی اردو کا ترجمان رسالہ ''اردو'' ۱۹۲۱ء میں دکن سے جاری ہوا۔ مولوی عبدالحق اس کے بانی تھے۔ یہ رسالہ مولوی عبدالحق کے ساتھ ساتھ دکن، دہلی اور پاکستان تک چلتا رہا۔ یہی مولوی صاحب کا رفیق سفر تھا۔ مولوی صاحب نے اس رسالے کے توسط سے بہت ساری نئی تحقیقات کو اہل اردو کے سامنے پیش کیا۔ قدیم متون کے سلسلے میں معیاری مضامین لکھے۔ نئے لکھنے والوں کو اس سے حوصلہ ملا اور نئی نسل نے اس روشنی میں اپنا ادبی سفر طے کیا۔ بہت سارے گم نام شہ پاروں کو مولوی صاحب نے اسی رسالے کے توسط سے نئی زندگی عطا کی۔ چوں کہ یہ خالص ادبی رسالہ تھا اس لئے ادب کے جملہ متعلقات پر اس رسالے میں بہت سارے متنوع مضامین شائع کیے گئے۔ خاص طور سے تحقیق و تدوین کے باب میں اس رسالے کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آج ہماری ادبی تاریخ میں جو نام بہت بلند قامت ہیں دراصل ان کے مضامین پہلے پہل اسی رسالے کی زینت بنے تھے۔

اس کڑی میں لاہور کا میگزین ''ہمایوں'' (مدیر: میاں بشیر احمد) بھی اہمیت کا حامل ہے اس کے نائب مدیر مولانا تاجور نجیب آبادی تھے۔ نیاز فتح پوری، حسن نظامی، میاں محمد شفیع، عبدالعزیز فلک پیما، خلیقی دہلوی اس کے قلم کاروں میں شامل تھے۔ بھوپال سے نیاز فتح پوری

۱۹۲۲ء میں ''نگار'' جاری کیا جس کے معاون مدیر مخمور اکبر آبادی تھے۔ نگار رومانوی نثر نگاری کا اعلا نمونہ تھا اور نثر لطیف کی مثال تھا۔ اس کے باوجود اس کا علمی اور ادبی قد اس قدر بلند تھا کہ اس کے قلم کاروں کی فہرست میں مجنوں گورکھ پوری، حامد حسن قادری، امتیاز علی عرشی، خواجہ احمد فاروقی، ابواللیث صدیقی، مسعود حسن رضوی ادیب جیسے سنجیدہ اور باوقار لوگ شامل تھے۔

اردو زبان اور مضمون نگاری کی تاریخ میں ''نگار'' کی خدمات بھی بہت وقیع ہیں۔ یہ رسالہ نیاز فتح پوری نے ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے نکالا تھا۔ نگار کی شناخت ایک رومانوی رسالے کے طور پر قائم ہوئی تھی لیکن اس میں علمی اور تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ شعری مباحث پر بھی خاطر خواہ مضامین چھپتے تھے۔ اس رسالے کے اہم قلم کاروں میں وہ تمام افراد شامل تھے جو اس دور میں ادب میں معزز شخصیات کے طور پر معروف ہو چکے تھے۔ مجنوں گورکھ پوری، احتشام حسین، سید مسعود حسن رضوی ادیب، امتیاز علی عرشی، سجاد حیدر یلدرم ان میں سے چند اہم نام ہیں۔ نگار کی شناخت ادب لطیف کے طور پر تھی اس میں شعری حسن و جمال سے پر نثر لکھی جاتی تھی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ نگار کی نثر میں شعریت کے وافر عناصر موجود تھے۔ ان مضامین کو پڑھ کر قاری ایک گونہ مسرت کے احساس کے سرشار ہوتا تھا۔ اس نثر میں جوش، ولولہ اور آہنگ کی خوبیاں مستزاد تھیں۔ رسالہ ''جامعہ'' بھی ۱۹۲۳ء سے لگاتار شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کے پہلے مدیر نور الرحمٰن تھے لیکن جلد ہی مولانا اسلم جیراج پوری نے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس رسالے کا مقصد اردو زبان کی ترویج و اشاعت تھا۔ اس کے مدیروں اور قلم کاروں میں اس دور کی عبقری شخصیات شامل تھیں۔ اس رسالے میں شائع شدہ تحقیقی اور تہذیبی مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی کا رسالہ ''ساقی'' بھی اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور مضمون نگاری کے فروغ کے لئے یاد رکھا جائے گا۔ یہ رسالہ ۱۹۳۰ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ جب شاہد احمد دہلوی قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے تو پھر وہاں سے اسے جاری کیا لیکن پاکستان میں یہ رسالہ اپنی کھوئی ہوئی چمک دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔ اس رسالے کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے بڑے بڑے قلم کاروں کو لکھنے کا سلیقہ سکھایا اور ادبی دنیا میں ان کی شناخت قائم کی۔ ترقی پسند تحریک اور اس زمانے کے بیش تر مصنفین کی تخلیقات اس رسالے کی مرہون منت ہیں۔ ساقی اپنے دہلوی لب و لہجے اور تہذیبی بازیافت کے مضامین کے لئے بہت مشہور ہوا تھا۔

غرض یہ کہ اردو مضمون نگاری کی ترقی میں جہاں مصنفین اور قلم کاروں کی خدمات کا ذکر ہوتا ہے وہیں ان رسائل کی خدمات کا ذکر بھی کیا جانا چاہیے۔ یہ رسائل ہی تھے جن کے سہارے مصنفین اور قلم کار مضامین لکھتے تھے اور شائع کراتے تھے۔ چوں کہ یہ رسائل الگ الگ ترجیحات کی بنیاد پر شائع ہوتے تھے اس لئے ظاہری طور سے ان میں کچھ اختلاف و امتیاز پایا جاتا تھا لیکن مجموعی طور سے یہ رسائل زبان و ادب کی خدمت نیز مضمون نگاری کے فروغ میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ تاریخ ادب میں یہی ان کا مقام ہے۔ ان رسائل نے مختلف رجحانات اور تحریکات کے لئے بھی سازگار ماحول تیار کیا۔ ''مخزن، اردوئے معلیٰ، زمانہ، جامعہ، ساقی، نیرنگ خیال، ہمایوں، ادب لطیف'' جیسے رسائل نے مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ تحریکات و رجحانات کو بھی فروغ دیا۔ ان میں سے ہر رسالہ جداگانہ وصف کا حامل تھا اور علاحدہ نظریات کی ترجمانی کرتا تھا۔ نظریات کی رنگارنگی اور تنوع نے قاری کے ذہن کے دریچوں کو روشن کرنے کا کام کیا، اس طرح ذہن انسانی زندگی کا رویہ زندگی کے تئیں مزید روشن، مزید واضح اور مزید سائنسی ہونے لگا۔ مضمون نگاری کے اس تنوع کی بدولت نثر نگاری کے کئی اسالیب بھی سامنے آئے۔ تنقید و تحقیق نے سائنسی اور معروضی انداز میں خود کو جلوہ گر کیا۔ انشائیہ نے رومانوی اور ہلکے پھلکے، غیر سنجیدہ انداز میں خود کو

ظاہر کیا۔ مذہبی مضامین نے موازنہ اور مناظرانہ اسلوب کی عکاسی کی۔ تاریخ اور سائنس کے موضوعات نے صاف اور سادہ اسلوب اپنایا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مضمون نگاری نے نہ صرف یہ کہ اردو نثری سرمایے میں اضافہ کیا بلکہ اس نے قاری کا ایک ایسا حلقہ بھی تیار کر دیا جو سماجی اور دیگر مسائل پر گہری نگاہ رکھتا ہو نیز اس نے نثری اسالیب کے مختلف انداز پیدا کر دیے۔ مضمون نگاری کی یہی خوبی ہے جس نے اس کو موجودہ دور میں بھی بامعنی بنائے رکھا ہے۔

02.09 اُردو کے اہم مضمون نگار

﴿۱﴾ ماسٹر رام چندر:۔

ماسٹر رام چندر کا نام سائنسی، سماجی اور علمی مضامین کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دہلی کالج میں استاد تھے۔ انہوں نے دو رسالے ''محبّ ہند'' اور ''فوائد الناظرین'' کے نام سے شائع کیے تھے جن میں سنجیدہ علمی اور سائنسی مضامین ہوا کرتے تھے۔ اس میں علمی مباحث کے لئے بھی گنجائش نکالی گئی تھی۔ فوائد الناظرین ۱۸۴۵ء میں جاری ہوا تھا جب کہ محبّ ہند ۱۸۴۷ء میں۔ محبّ ہند پہلے خیر خواہ ہند کے نام سے جاری ہوا تھا لیکن چوں کہ اسی نام کا ایک اور رسالہ مرزا پور سے بھی جاری ہو رہا تھا اس لئے ماسٹر رام چندر نے اپنے رسالے کا نام محبّ ہند تجویز کر دیا تھا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ ان تینوں رسائل کی زبان علمی تھی اور مضامین سنجیدہ نوعیت کے ہوتے تھے۔ سائنس، مذہب، تاریخ، آرٹ اور سماجی علوم جیسے موضوعات کا ان رسائل میں احاطہ کیا جاتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان رسائل کی زبان صاف، سادہ اور شگفتہ ہوتی تھی۔ اس طرح سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مضمون نگاری کی ابتدا دہلی کالج کے احاطے سے ہوئی تھی، نیز سنجیدہ اور علمی مضامین کے بنیاد گزاروں میں ماسٹر رام چندر کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ سرسید نے اس روایت کو فروغ بخشا اور اس کوشش میں انہوں نے اتنی جہات پیدا کر دیں کہ ان کی خدمات کے آگے دہلی کالج اور ماسٹر رام چندر کی خدمات کا رنگ پھیکا معلوم ہونے لگا۔ بلاشبہ سرسید کی خدمات اپنی جگہ مسلم اور ہمہ جہت ہیں لیکن دہلی کالج اور ماسٹر رام چندر کی خدمات سے انکار کرنا درحقیقت تاریخی صداقت کے خلاف ہوگا۔

﴿۲﴾ سرسید احمد خاں:۔

سرسید نے مضمون نگاری کے ذریعے غور و فکر کی راہیں ہم وَار کیں۔ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور سماجی بہبود کے لئے انہوں نے جو کام کیے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ان کی تحریروں نے اردو نثر میں علمی متانت، سنجیدگی اور طرزِ استدلال کو فروغ دیا۔ سادہ نثر نگاری کی ایسی روایت قائم ہوئی کہ ذہنوں میں پیدا ہونے والے خیالات دل میں اُترنے لگے اور فکری انقلاب کی راہیں ہم وَار ہونے لگیں۔

سرسید نے مغربی مصنفین و مفکرین کے طرزِ فکر سے استفادہ کیا اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے مضمون نگاری کی صنف کو پروان چڑھایا۔ سرسید نے خاص طور سے تین قسم کے مضامین لکھے ہیں: مذہبی، سیاسی اور اصلاحی۔ ان بنیادی موضوعات کی مزید ذیلی تقسیم بھی کی جاسکتی ہے۔ یوں تو سرسید کا خاص انداز سلاست و روانی کی خوبیوں کا حامل ہوتا ہے لیکن بعض مقامات پر علمی و اصطلاحی الفاظ کی کثرت مضمون کے لطف کو متاثر کر دیتی ہے۔

چوں کہ سرسید ان مضامین میں خالص ادیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مصلح اور ہم دردِ قوم کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اس لئے ان مضامین میں جملہ ادبی محاسن کی تلاش مناسب نہیں ہوگی البتہ ہم دردی، قوم کا غم، اصلاح کی خواہش یہ ایسے عناصر ہیں جو اُن کے مضامین میں درد و تاثیر کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ خوشامد، بحث و تکرار، اپنی مدد آپ، امید کی خوشی، تعلیم و تربیت، تعصب وغیرہ ایسے ہی مضامین ہیں جن میں درد و اثر بھرپور طور سے موجود ہے۔

سرسید کے مضامین میں بعض کمزوریوں نے بھی راہ پائی ہے۔ ان کے مضامین میں علمی اور اصطلاحی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے لطف مضمون متاثر ہونے لگتا ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اصلاحی رنگ جب زیادہ غالب ہو جاتا ہے تو سرسید مبلغ اخلاق نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی ادبیت مجروح ہونے لگتی ہے۔ جب سنجیدگی کا عنصر بے لگام ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ مضمون کی بے نمکی اور بے لطفی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان چند کمزوریوں کے باوجود سرسید اردو کے بڑے اہم مضمون نگار کہے جائیں گے۔ یہ سرسید کا ہی فیضان تھا کہ ان کی اور ان کے رفقا کی کوششوں کی بدولت جدید اردو نثر کا سرمایہ بہت ہی قلیل مدت میں متمول اور ثروت مند ہو گیا۔ سوانح نگاری، ناول نگاری، انشائیہ نگاری، مکتوب نگاری؛ غرض کہ ہر صنف نثر نے توسیع کے امکانات کو مزید روشن کر دیا۔

سرسید کی ان خدمات کے ساتھ اردو نثر کے اسلوب کے سلسلے میں بھی ان کے کارناموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ تہذیب الاخلاق میں انہوں نے جس انداز سے براہ راست اسلوب کی بنیاد رکھی تھی اور اس اسلوب میں بات کے دل سے نکلنے اور دل پر اثر کرنے کی جو خداداد صلاحیت موجود تھی وہ آج تک اردو نثر کا بہترین اسلوب قرار دیا جاتا ہے۔

02.10 خلاصہ

جدید نثری اصناف میں مضمون نگاری اپنی افادیت کی وجہ سے بہت نمایاں نثری صنف ہے۔ اس کا آغاز و ارتقا دہلی کالج کا رہین منت ہے۔ دہلی کالج میں طلبا کے امتحان میں ایک پرچہ مضمون نگاری کا ہوتا تھا جس میں کسی خاص عنوان پر طلبا کو مضمون نگاری کرنی ہوتی تھی۔ سب سے بہتر مضمون پر انعامات دیے جاتے تھے۔ عام طور سے مذہبی، علمی اور سائنسی موضوعات پر مضامین قلم بند کرائے جاتے تھے۔ دہلی کالج نے ایک رسالہ بھی ''قران السعدین'' کے نام سے ۱۸۴۵ء میں جاری کیا تھا جس میں کالج کی روداد اور مضامین کی تفصیلات شائع ہوتی تھیں۔ اس طرح سے مضمون نگاری کے سفر میں دہلی کالج ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دہلی کالج میں ماسٹر رام چندر اردو کے اولین مضمون نگار کہے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں محققین میں اختلاف رائے موجود ہے۔ بعض اہل علم سرسید احمد خاں کو اردو کا اولین مضمون نگار قرار دیتے ہیں لیکن جملہ شواہد اور دلائل کی رو سے ماسٹر رام چندر اردو کے اولین مضمون نگار کہے جا سکتے ہیں۔

مضمون دراصل ایسی تحریر کو کہتے ہیں جس میں کسی بھی موضوع یا مسئلے پر معلوماتی یا تجزیاتی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ مضمون میں علمیت کا رنگ گہرا ہوتا ہے اور اس کی فضا بہت سنجیدہ ہوتی ہے۔ معلوماتی مضامین کا انداز غیر شخصی اور غیر جانب دارانہ ہوتا ہے۔ عام طور سے مضمون کی طوالت بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ اوسط سائز کی تحریر کو مضمون کہا جاتا ہے، البتہ جب یہی تحریر مزید وضاحت، طوالت اور مزید تشریحات کی حامل ہو جاتی ہے تو اس کو مقالہ کہتے ہیں۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس میں کسی موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ادبی موضوعات پر تحریر مضامین کی نوعیت تنقیدی، تحقیقی اور لسانیاتی ہوتی ہے۔

غیرادبی موضوعات میں مذہب، فلسفہ، سوانح، سماج، سیاست، اقتصادیات، صنعت وحرفت، تجارت، زراعت، ماحولیاتی آلودگی، طب، صحت، قانون، سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ مضامین معلوماتی مضامین کے دائرے میں آتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جب جدید نثری اصناف کا سورج طلوع ہوا اور ہندوستانیوں میں بیداری پیدا کرنے کے مقصد سے اہل علم ونظر نے ادب کا سہارا لیا تو صنف مضمون نگاری بھی اسی انقلاب کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگر چہ مضمون نگاری کی ابتدا دہلی کالج کے زیر سایہ ہو چکی تھی لیکن اس میں رفتار اور تیزی اس وقت پیدا ہوئی جب وہ سرسید اور رفقائے سرسید کے دامن عاطفت میں پل بڑھ کر جوان ہوئی۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے وسیلے سے اردو مضمون نگاری کو نئی بلندیوں پر پہنچایا اور عام ہندوستانی کو بیدار کرنے کا کام کیا۔ علمی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی طور سے ان کے مفادات کا تحفظ کیا نیز ان کے اندر احساس کم تری کی جگہ اعتماد اور خودداری کی صفات پیدا کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ یہ کام سرسید اور رفقائے سرسید نے اپنی علمی اور سماجی تحریروں کے وسیلے سے کیا۔ چوں کہ سرسید ادب برائے زندگی کے نظریے پر ایمان رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں میں اصلاحی اور افادی رنگ کو غالب رکھا۔ اس انداز نے سرسید کی تحریروں کو سادگی اور سلاست کی خوبی سے معمور کر دیا تھا۔

سرسید کے رفقا میں حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، وقار الملک، محسن الملک، مولوی ذکاء اللہ اور مولوی چراغ علی نے بھی سرسید کے شانہ بشانہ ان کے اصلاحی اور تبلیغی مشن کو آگے بڑھانے میں بھرپور معاونت کی، اور اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کی عام بیداری میں حصہ لیا۔ سرسید کے مشن اور اسلوب زبان کے مقابلے میں اودھ پنچ نے اپنا رنگ جمایا۔ یہ طنزیہ ومزاحیہ قسم کا رسالہ تھا جو لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کی ادارت میں ماہانہ بنیاد پر شائع ہوتا تھا۔ مختلف معاصر مسائل پر ایک خاص انداز سے اس رسالے میں اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے قلم کاروں میں اکبر الہ آبادی جیسے مشاہیر ادب شامل تھے۔ اودھ پنچ نے طنزیہ ومزاحیہ مضمون نگاری کے بعض دل کش نمونے پیش کیے اور اردو صحافت کو معاصر مسائل کی ترجمانی کا نقیب بنا دیا۔ اسی دور میں رومانوی نثر نگاروں نے بھی اپنے طور پر ادب کی خدمات انجام دینے کا بیڑا اٹھایا۔ ان لوگوں میں میر ناصر علی، مہدی افادی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، عبدالقادر، عبدالعزیز فلک پیما وغیرہ نے ادب برائے ادب کے نظریے کی اشاعت کی، اور خالص علمی ورومانوی انداز میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف النوع مضامین اور مختلف النوع اسالیب کا ایک سلسلہ چل نکلا اور اردو مضمون نگاری کا دامن مختلف قسم کے جواہر ریزوں سے معمور ہو گیا۔ رسائل وجرائد کی اشاعت نے مضمون نگاری کے فن کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے بدلے ہوئے حالات میں مستقل کتابوں کے بجائے مضمون نگاری سے زیادہ کام لیا گیا۔ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی اردو اخبارات ورسائل کثرت سے شائع ہونے شروع ہوئے۔

انیسویں صدی میں تہذیب الاخلاق اور اودھ پنچ نے جس طرح ذہنوں کی آبیاری کی تھی، اس نے بیسویں صدی میں صحافت کے فن کو نئی بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ مخزن، معارف، ساقی، رسالہ اردو، ہمایوں، بشیر، زمانہ، نیا ادب، جیسے رسائل نے مختلف نظریات کے تحت مضمون نگاری کے دائرے کو مزید وسیع کرنے کا کام کیا۔ ان رسائل نے مضمون نگاری کو عام کیا۔ عہد سرسید کے بعد عبدالحلیم شرر، میر ناصر علی، مہدی افادی، محمود شیرانی، رشید احمد صدیقی، وحیدالدین سلیم، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ غلام السیدین، عابد حسین، محمد مجیب اور ذاکر حسین نے علمی اور تحقیقی موضوعات کے تعلق سے مضمون نگاری کے سرمایے میں بہت اضافہ کیا۔ موجودہ دور میں اردو اخبارات ورسائل کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے جس کے باعث مضمون نگاری کی روایت کو غیر معمولی طور سے فروغ حاصل ہوا ہے۔

02.11 فرہنگ

تسلط : غلبہ، قبضہ

تعقل پسندی : عقل کو رہنما بنانے کا رجحان

حجم : سائز (لمبائی چوڑائی موٹائی)

دفاع کرنا : دور کرنا، زائل کرنا

سماجی بہبود : سماج کی بھلائی اور بہتری کا کام

ضبطِ تحریر : لکھنا

طوالت : لمبا، طویل سے بنا ہے

مبلغ اخلاق : اخلاق کی تعلیم و تلقین کرنے والا

متوازی : برابر، مدمقابل (ریل کی دونوں پٹریاں متوازی ہوتی ہیں)

مرقع نگاری : لفظوں کی مدد سے تصویر کھینچنا

مساعی : کوششیں

معاصر : موجودہ دور کی

02.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ سرسید کی مضمون نگاری پر ایک مضمون لکھئے۔

سوال نمبر۲ مضمون نیز دیگر نثری اصناف کا موازنہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ اودھ پنچ کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ غیرافسانوی نثر میں مضمون نگاری کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ مضمون نگاری کے سلسلے میں اردو رسائل کی خدمات کا ذکر کیجیے۔

سوال نمبر۳ چند اہم مضمون نگاروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : ''مضمون'' کا تعلق کس قسم کی اصناف سے ہے؟

(الف) قدیم اصناف (ب) جدید اصناف (ج) مابعدِ جدید (د) شعری اصناف

سوال نمبر۲ : اردو کا پہلا مضمون نگار کون ہے؟

(الف) ماسٹر رام چندر (ب) مولوی عبدالحق (ج) رشید احمد صدیقی (د) غلام حسین

سوال نمبر۳ : رسالہ ''قران السعدین'' کس ادارے سے جاری ہوا؟

(الف) بدایوں کالج (ب) سینٹ جانس کالج، آگرہ (ج) دہلی کالج (د) بریلی کالج

سوال نمبر۴ : شبلی نے کس قسم کی مضمون نگاری کی؟

(الف) تہذیبی (ب) سماجی (ج) معاشی (د) تاریخی

سوال نمبر۵ : حالؔی نے کس قسم کی مضمون نگاری کی؟

(الف) معاشی (ب) تنقیدی (ج) تاریخی (د) معاشرتی

سوال نمبر۶ : رسالہ ''اودھ پنچ'' کا مدیر کون تھا؟

(الف) ماسٹر رام چندر (ب) محمد حسین آزاد (ج) منشی سجاد حسین (د) مولوی باقر

سوال نمبر۷ : ''رسالہ'' کی جمع کیا ہے؟

(الف) رسل (ب) رسول (ج) مرسل (د) رسائل

سوال نمبر۸ : ''رُفقا'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) رفاقت (ب) رفیق (ج) مرفوق (د) مرفق

سوال نمبر۹ : ''نثر'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) نظم (ب) نظامت (ج) نجوم (د) ناظمہ

سوال نمبر۱۰ : ''متوسط'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) نیچے کا (ب) ضخامت (ج) درمیانی (د) اوپری

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ب) جدید اصناف	جواب نمبر۶	: (ج) منشی سجاد حسین
جواب نمبر۲	: (الف) ماسٹر رام چندر	جواب نمبر۷	: (د) رسائل
جواب نمبر۳	: (ج) دہلی کالج	جواب نمبر۸	: (ب) رفیق
جواب نمبر۴	: (د) تاریخی	جواب نمبر۹	: (الف) نظم
جواب نمبر۵	: (ب) تنقیدی	جواب نمبر۱۰	: (ب) ضخامت

02.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ از سیدہ جعفر

۲۔ فن کار سے فن تک از ابوذر عثمانی

۳۔ تاریخِ ادب اردو از جمیل جالبی

۴۔ اردو میں انشائیہ نگاری از رفیع الدین ہاشمی

۵۔ اردو میں انشائیہ نگاری از بشیر سیفی

۶۔ اردو اسیز از سید ظہیر الدین مدنی

۷۔ اردو میں مضمون نگاری کا ارتقا از سیدہ جعفر

۸۔ سرسید اور ان کے نام وَر رفقا از سید عبداللہ

اکائی 03 انشائیہ نگاری کا فن

ساخت

03.01 : اغراض ومقاصد

03.02 : تمہید

03.03 : انشائیہ کا مفہوم اور تعریف

03.04 : انشائیہ کی صنفی خصوصیات

03.05 : انشائیہ سے متعلق ایک مختلف نقطۂ نظر

03.06 : اردو انشائیے کا آغاز وارتقا

03.07 : خلاصہ

03.08 : فرہنگ

03.09 : سوالات

03.10 : حوالہ جاتی کتب

03.01 اغراض ومقاصد

جدید اردو کا آغاز اور فروغ وارتقا سرسید کی علی گڑھ تحریک کا مرہونِ منت ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ہندوستانی سماج، سیاست اور تہذیب میں ہر سطح پر ہمہ گیر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ صدیوں کا سیاسی اقتدار ہاتھ سے نکل جانے کے کے بعد مسلمانوں میں مایوسی عام تھی۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دے کر اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ ایسے حالات میں سرسید نے مسلمانوں کو روشن خیالی کی راہ پر گام زَن کرنے کے لئے علی گڑھ کی تحریک کی ابتدا کی۔

سرسید نے علی گڑھ تحریک کے مشن کو فروغ دینے کے لئے نثر کے ایسے اسلوب کو اختیار کیا جو تکلف وتصنع سے پاک تھا اور بے تکلفی، سادگی اور شستگی جس کی اہم خصوصیت تھی۔ آگے چل کر سماجی حالات کے تقاضوں کے تحت جب نئی ادبی اصناف کا ظہور ہوا تھا تو تمام اصناف نے قارئین سے تخاطب کے لئے نثر کے اسی سلوب کو اپنایا جسے سرسید اور ان کے رفقاء نے اختیار کیا تھا۔ اردو نثر کی مروّجہ اصناف کو ہم سہولت کے لئے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

﴿۱﴾ **افسانوی اصناف:**۔ اس کے تحت ناول، افسانہ، اور ڈرامہ جیسی اصناف آتی ہیں۔ جن میں کوئی کہانی بیان کی جاتی ہیں۔

﴿۲﴾ **غیر افسانوی اصناف:**۔ اس کے تحت وہ تمام اصناف ادب آتی ہیں جن میں قصہ یا کہانی شامل نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر خاکہ، آپ بیتی، سوانح، رپورتاژ، سفرنامہ، مضمون اور انشائیہ وغیرہ۔

پیش نظر اکائی میں آپ غیر افسانوی نثری اصناف کے تحت صنف انشائیہ کا مطالعہ کریں گے۔اس اکائی کا مقصد طلبا کو انشائیہ کے فن، اس کی خصوصیات، انشائیہ کی ابتدا اور اس کے فروغ سے طلبا کو واقفیت بہم پہنچانا ہے۔

03.02 تمہید

انشائیہ اردو زبان کی جدید نثری اصناف میں سے ایک اہم صنف ہے۔اردو کی دیگر جدید اصناف مثلاً: ناول، افسانہ، ڈرامہ، خاکہ، رپورتاژ، آپ بیتی، سوانح عمری اور سفرنامہ وغیرہ کی طرح انشائیہ بھی انگریزی سے اردو زبان میں آیا۔انگریزی میں اسے (ESSAY) کہا جاتا ہے۔انشائیہ نگار بے ساختہ اور فطری انداز میں شخصی خیالات وتاثرات کو پیش کرتا ہے۔اس کی پیش کش ایسی دل چسپ ہوتی ہے کہ انشائیہ کا مطالعہ کرنے والا ایک نئے تجربے اور نئی بصیرت سے دوچار ہوتا ہے۔اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انشائیہ کا سفر مسرّت سے شروع ہوکر بصیرت پر تمام ہوتا ہے۔انشائیہ میں غزل کا سا انداز ہوتا ہے کیوں کہ انشائیہ نگار گہرے اور پیچیدہ خیالات اور فلسفیانہ افکار ومباحث کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ ایک خوش گوار فضا قائم ہوجاتی ہے۔انشائیہ نگار فطری اور بے ساختہ گفتگو کا طرز اختیار کرتا ہے۔لہٰذا انشائیہ میں ترتیب اور منصوبہ بند طریقے سے خیالات کا اظہار نہیں ہوتا۔

انشائیہ کی اس خصوصیت کی وجہ سے انشائیہ نگار کو اپنی جولانی طبع دکھانے کا بھرپور موقع میسر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ناقدین ادب انشائیہ کو غیر منظّم ادب پارہ بھی کہتے ہیں۔مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ احساس وجذبات، شعریت ونزاکت، وسعتِ علم اور دوست زندگی سے عبارت ہے کہ اس میں زندگی کے کسی بھی تجربے اور گوشے یا واقعہ کو اظہار خیال کے لئے منتخب کیا جاسکتا ہے۔

03.03 انشائیہ کا مفہوم اور تعریف

جس طرح اردو ادب کے ناقدین نے آج تک اردو کی بعض اصناف مثلاً: ناول اور افسانہ وغیرہ کی ایسی جامع تعریف وضع کرنے سے قاصر ہے۔جس پر تمام ناقدین کو اتفاق ہو۔اسی طرح آج تک اردو میں انشائیہ کی بھی کوئی ایسی جامع تعریف متعین نہیں ہوسکی ہے جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔پھر بھی ہمیں انشائیہ کا مفہوم واضح کرنے کے لئے اس کی تعریف کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی زبان کی طرح اس کی اصناف میں میں بھی اتنا تنوع اور رنگارنگی ہوتی ہے کہ کسی صنف ادب کی ایسی جامع اور مکمل تعریف وضع کی جائے کہ اس میں اس صنف کی تمام تر خصوصیتیں سما جائیں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔دراصل کسی صنف کی وضع کردہ تعریف اس کی ایک یا زیادہ سے زیادہ چند خصوصیتوں کا ہی احاطہ کرتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ انشائیہ کی تعریف کے سلسلے میں بھی ناقدین کے درمیان اختلاف رائے موجود ہے۔لیکن اصناف ادب کی رنگارنگ خصوصیتوں اور ناقدین کے درمیان اس کی تعریف کے سلسلے میں اختلاف رائے کے باوجود کسی صنف کا مفہوم سمجھنے اور اس کے ادب پاروں کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں اس صنف کی رائج کردہ تعریفوں کی جانب رجوع ہونا پڑتا ہے۔

انشائیہ ہماری زبان میں مغرب سے آیا۔دراصل اردو زبان کے لفظ ''مضمون'' کی طرح انگریزی زبان کا لفظ (ESSAY) بہت وسیع المعنی لفظ ہے۔کیوں کہ لفظ ''ESSAY'' میں ''ESSAY'' کی تمام قسمیں شامل ہیں۔انشائیہ کی صنف چوں کہ ہمارے یہاں انگریزی سے آئی اس لئے انشائیہ کا مفہوم واضح کرنے کے لئے ہمیں انگریزی زبان میں اس کی تعریفوں سے مدد لینی پڑے گی۔

اردو لفظ مضمون'' کی طرح انگریزی زبان کے (ESSAY) میں زندگی اور سماج وتہذیب سے متعلق کسی بھی مسئلہ، پہلو، یا گوشے کو اظہارِ خیال کے لئے منتخب کیا جاسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انشائیے کو انگریزی زبان میں ''PERSONAL OR LIGHT ESSAY'' بھی کہا جاتا ہے۔ (ESSAY) کی تعریف انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں حسب ذیل ہے:

''ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے (ESSAY) اوسط لمبائی کا ایک ایسا مضمون ہے، جو کہ عموماً نثر میں ہوتا ہے اور جس میں سہل اور سرسری انداز میں کسی موضوع سے اور سچ پوچھئے تو صرف اس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔''

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں درج انشائیہ کی مندرجہ بالا تعریف میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ انشائیہ نگار کے شخصی اور ذاتی تاثرات ہیں۔ یعنی انشائیہ نگار کا احساس، خیال یا جذبہ جس واقعہ یا کسی خارجی کیفیت یا مشاہدہ سے متاثر ہوتا ہے اسے موضوع بنا کر انشائیہ نگار اپنے ذاتی تاثرات یا شخصی کیفیات کو صفحۂ قرطاس پر الفاظ کے پیکر میں پر لطف، شگفتہ اور شائستہ اسلوب میں قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ (ESSAY) میں شخصی تاثرات اور ذاتی تجربات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کی مندرجہ بالا تعریف میں انشائیہ کی جس دوسری خصوصیت پر زور دیا گیا ہے وہ انشائیہ نگاری کا سہل اور سرسری انداز ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ انشائیہ نگار اپنے ذاتی اور شخصی تاثرات کے بیان میں ہمہ وقت اس شرط کو ملحوظ رکھے کہ انشائیہ میں سنجیدگی، یا بوجھل پن پیدا نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ اگر انشائیہ میں غیر ضروری سنجیدگی یا بوجھل پن پیدا ہو جائے تو وہ ادب پارہ انشائیہ کی تعریف پر پورا نہیں اتر سکتا۔

انگریز ناقد ایف. ایچ. ہرپچرڈ نے بہترین انشائیوں کے انتخاب پر مبنی ایک کتاب (GREAT ESSAY OF ALL NATION) کے عنوان سے مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں انشائیہ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہرپچرڈ ''ESSAY'' کی دو خصوصیت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ ہرپچرڈ کے مطابق ''ESSAY'' کا انداز سادہ ہو اور اور دوسری خصوصیت یہ کہ غیر مصنوعی ہو۔ سادہ اور غیر مصنوعی یعنی بے تکلف انداز بیان انشائیہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ غرض کہ انشائیہ نگار کی تحریر اور بیان میں سادہ اور بے تکلف انداز اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ غیر فطری طرز و اسلوب سے احتراز کر لے۔ پرپچرڈ کی طرح ہوسٹن پیٹرسن نے بھی بہترین انشائیوں کے انتخاب پر مبنی ایک کتاب ''GREAT ESSAY'' کے عنوان سے مرتب کی ہے۔

اس کتاب میں ہوسٹن اور پیٹرسن نے انشائیہ کی مندرجہ ذیل تعریف بیان کی ہے:

''انشائیہ ایک نثری تحریر ہے جو ایک سے لے کر بیس یا تیس صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کا انداز شخصی بھی ہو اور غیر مصنوعی بھی۔ اس میں حکیمانہ فکر تو ہو سکتی ہے لیکن سنجیدگی کے ساتھ نہیں۔ اس میں فلسفہ تو ہوگا لیکن فلسفیانہ باقاعدگی نہیں ہوگی۔ اس میں ایک غیر مربوط وحدت ہوگی اور موضوع سے ایک خوشگوار انحراف بھی ہوگا۔ انشائیہ نگار کے نقطۂ نظر اور رائے سے اتفاق ضروری نہیں۔ اور وہ اپنے نقطۂ نظر اور رائے سے اتفاق کرنے پر بھی مجبور نہیں کرتا۔ انشائیہ نگار ایک دوست کی طرح اپنی بات کہتا ہے۔ وہ الفاظ کو برتنے کا فن جانتا ہے۔ ورجینیا وولف کے نزدیک انشائیہ کے لئے اولین

شرط یہ ہے کہ اسے یہ جاننا چاہیے کہ اسے کس طرح لکھنا چاہیے۔انشائیہ کوترجمہ کرنے سے اتنا ہی نقصان پہنچتا ہے جتنا کہ غزل کا ترجمہ کرنے سے غزل کو پہنچتا ہے۔''

ہوسٹن پیٹرسن نے انشائیہ کی مندرجہ بالاتعریف میں انشائیہ کی تقریباً تمام اہم خصوصیتوں کوسمیٹ لیا ہے۔اس اعتبار سے ہوسٹن پیٹرسن کی بیان کردہ انشائیہ کی تعریف زیادہ جامع ہے۔اس کے ذریعہ ہم انشائیہ کے خدوخال کا تعین آسانی سے کرسکتے ہیں۔

اردوزبان میں انشائیہ کی تعریف وضع کرنے کے سلسلے میں کافی بحثیں ہوچکی ہیں۔تقریباً تمام ناقدین ادب اس امر پر متفق ہیں کہ انشائیہ کو بے تکلف اور غیر رسمی ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ کسی ناقد نے انشائیہ میں مزاح کے عناصر کی شمولیت کی حمایت کی ہے تو کسی نے انشائیہ کومزاح سے دوررکھنے کی وکالت کی ہے۔لیکن اس نکتہ پر سبھی متفق ہیں کہ انشائیہ بہرحال مزاح نگاری نہیں ہے۔

البتہ انشائیہ میں مزاح کی آمیزش دیگر بات ہے جوانشائیہ کے رنگ کومناسب طریقے سے نکھارنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔چنانچہ اردو کے مزاح نگاروں نے کثرت سے ایسے مضامین لکھے ہیں جن میں بہترین انشائیہ کی صفات موجود ہیں۔

ڈاکٹرمحمد حسنین انشائیہ میں مزاح کی آمیزش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مزاح کو ذاتی طور پر میں انشائیہ کا جوہر ہی نہیں جوہر اعظم قرار دیتا ہوں۔یہ(مزاح) انشائیہ نگاری کی سیرت وسرشت کا خمیر ہے۔اوریہی اس کے فن جلوۂ صدرنگ بھی ہے۔''

مضمون:صنف انشائیہ اورانشائیے...ڈاکٹرمحمد حسنین

اردوزبان میں انشائیہ کی تعریف متعین کرتے ہوئے داکٹرمحمد حسنین لکھتے ہیں کہ:

''ایک جملے میں انشائیہ کی تعریف مشکل ہے۔صنفی اورفنی لحاظ سے ہمارے یہاں یہ''ادب پارہ'' بنا ہے اور قابل تعریف۔انگریزی ادب میں مصروف عام ہے۔انگریزی تعریفوں میں جانسن کا فقرہ بہت موزوں ہے۔وہ کہتا ہے''**He is a loose sally of mind**''یعنی انشائیہ دماغ کی ایک ترنگ ہے۔آزاد وخوش گوارلفظ''ترنگ''انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔وہ روح جس میں جولانی ہے مگرگرمی نہیں، جس میں انتشار ہے مگر پراگندگی نہیں،وہ روح جودماغ سے زیادہ دل کوچھیڑتی ہے۔انشائیہ کسی عنوان پرقلم کار کی گپ ہے۔یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی یہ ذاتی ہوتی ہے۔اس میں آپ بیتی اور پرائی بیتی دونوں کا لطف ہوتا ہے۔یہ ذہنی لہروں کی پیداوار ہے۔اچھااور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے۔جس کی ہر چنگاری آزادومنتشر ہوتی ہے۔ہم اسے ادب کی ایک پھل جھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔''

مضمون:ادب کی ایک خاص صنف انشائیہ.....ڈاکٹرمحمد حسنین

نظیرصدیقی انشائیے کی تعریف ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

''انشائیہ نام ہے اس مضمون کا جس کی لمبائی ایک سے بیس یا تیس صفحہ تک کچھ بھی ہوسکتی ہے۔جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی جاسکتی ہے۔جواپنے مشن اوراسلوب دونوں اعتبار سے شخصی ہوتا ہے..... جو

اندازِ فکر یا اندازِ نظر یا اندازِ بیان کے اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی لائٹ ہوتا ہے۔جس میں گہری سے گہری بات بھی سہل اور سرسری انداز میں کہی جاتی ہے۔جس میں عدم سنجیدگی اور لا اُبالی پن کی فضا پائی جاتی ہے۔جس میں طنز اور مزاح کے عناصر جلی بھی ہو سکتے ہیں اور خفی بھی۔جس کا مقصد قاری کو محظوظ کرنا بھی ہوسکتا ہے اور اسے سوچنے پر مائل کرنا بھی۔''

مضمون انشائیہ کیا ہے.....نظیر صدیقی

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ''مضمون'' اور ''انشائیہ'' ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔انشائیہ اور مضمون میں جو فرق ہوتا ہے اُسے بہتر طریقے سے اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب ایک ہی موضوع پر انشائیہ نگار اور مضمون نگار خامہ فرسائی کریں۔

دراصل مضمون موضوع کی گہرائی اور سنجیدگی اور دلائل کا متقاضی ہوتا ہے، جب کہ انشائیہ نگار کا نقطۂ نظر ہمیشہ شخصی اور ذاتی ہوتا ہے۔ افکار و خیالات میں یکسانیت کے باوجود انشائیہ نگار سنجیدگی اختیار نہیں کرتا۔وہ اظہارِ خیال کے چاہے جس موضوع کو منتخب کرے اس کے انداز بیان میں شگفتگی اور شادابی ہر حال موجود رہتی ہے۔لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ انشائیہ نگار اپنے موضوع کا نہیں بلکہ اپنے موڈ کے تابع ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا مباحث انشائیہ کی تعریف بھی متعین کرتے ہیں اور اس کے مفہوم کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔

03.04 انشائیہ کی صنفی خصوصیات

معروف انگریز ادیب و ناقد ڈاکٹر سیمول جانسن نے انشائیہ کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''He is a loose sally of mind''

یعنی انشائیہ ذہن کی ایک آزاد ترنگ ہے۔یہ ترنگ اپنے آپ میں آزاد، خود مختار اور خوش گوار ہے۔جانسن کی بیان کردہ انشائیہ کی اس تعریف میں ''ترنگ'' کلیدی لفظ ہے۔جو انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔یعنی ایک ایسی روح جس میں تڑپ اور لپک ہے، مگر یہ جلا کر راکھ نہیں کرتی بلکہ سکون و آسودگی بخشتی ہے۔اس کی لپک سے ایسی روشنی پیدا ہوتی ہے جو اندھیرے منظر کو روشن کر دیتی ہے۔انشائیہ کی روح دماغ سے زیادہ دل کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔

انشائیہ کی مثال ذہن کی آزاد ترنگ سے دی جاتی ہے لہٰذا انتشار اس کا وصف ہے، مگر یہ انتشار پراگندگی سے آلودہ نہیں۔انشائیہ کی یہ صفات اسے دوسری اصناف ادب سے منفرد اور ممتاز کرتی ہیں۔انتشار انشائیہ کی وسعت کا ضامن ہے۔کیوں کہ دل چسپ گفتگو کرنے والا شخص جب ترنگ میں آکر گفتگو کرتا ہے تو گفتگو کا دائرہ خود بخود موضوع کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور شگفتگی اور بے تکلفی گفتگو میں شامل ہو کر بات کو پُر لطف بنا دیتی ہے۔یہی سبب ہے کہ انشائیہ میں مصنف کی شخصیت بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔انشائیہ کے ذریعے ہم مصنف کے ذوق و شوق، پسند و ناپسند، محبت و عداوت اور عقائد و توہمات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔دراصل انشائیہ نگار اپنی دبی ہوئی خواہشات اور عادات و اطوار کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے کہ بات بھی مکمل ہو جائے اور پردہ بھی قائم رہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انشائیہ میں جو باتیں کہی جائیں ان کا انشائیہ نگار سے بہر حال کوئی تعلق ہو۔

دراصل انشائیہ کا حسن، دل کشی اور تاثیر اس کے شخصی اور ذاتی ہونے کے وصف سے مشروط ہے۔ انشائیہ نگار غیر شخصی باتوں کو بھی شخصی اور ذاتی انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ انشائیہ ذاتی احساسات اور جذبات وخیالات کو آزادانہ طور پر بیان کرنے کے لئے وجود میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ کے اولین مصنف مونٹین نے انشائیہ کو ''Self Portrait'' یا ذاتی شبیہ سے تعبیر کیا ہے۔ انشائیہ میں مواد اور ہیئت دونوں پر مصنف کی شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔

انشائیہ نگار معمولات زندگی میں جب کسی واقعہ یا حادثہ سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے جذبات واحساسات متحرک ہو جاتے ہیں اور خیالات کی رَو بہہ نکلتی ہے جس کا راستہ متعین نہیں ہوتا۔ چنانچہ انشائیہ کا مصنف دماغ کا نہیں دل کا تابع ہوتا ہے۔ جذبات واحساسات کے بہاؤ کی وجہ سے انشائیہ میں ایک قسم کا آہنگ اور لَے کا جنم ہوتا ہے۔ یہ آہنگ یا لَے جتنی تیز ہوتی ہے انشائیہ اتنا ہی کامیاب مانا جاتا ہے۔ اسی لئے انشائیہ کو غنائیہ یا ''Lyric'' کے مشابہ اور مماثل بھی قرار دیا جاتا ہے۔

اردو کے ممتاز انشائیہ نگار رشید احمد صدیقی اپنے انشائیوں میں خیال کی آزاد ترنگ اور اس کی لَے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے ہیں مربوط اور مسلسل نظم کے مانند ہیں۔''

انشائیہ کی ایک خصوصیت انتشار کا ذکر کرتے اپنے انشائیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور ہلکی پھلکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق تھیں۔ میں خود نہیں بہکتا تھا، دوسروں کو بہکنے اور بہلنے کی فرصت دیتا تھا عقل کی باتیں دیر تک سنی جا سکتی ہیں نہ سنائی جا سکتی ہیں۔''

انشائیہ کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ باتوں باتوں میں ایسی پتے کی بات کہہ دی جائے کہ پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے نئی بصیرتوں کے در کھل جائیں۔ انشائیہ نگار اپنی حکمت عملی سے ایسی باتیں کرتا ہے کہ اس کا قاری باتوں سے بہلتا رہے اور ہمہ تن گوش ہو کر اس کی باتیں سنے۔ انشائیہ نگار فلسفی کی مانند عقل کی باتیں نہیں کرتا بلکہ عقل مندی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ فلسفیانہ موشگافی نہیں کرتا بلکہ پُر لطف طریقے سے زندگی کے پیچ وخم اور اسرار ورموز سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اس کا مقصد دل چسپ باتیں کر کے دوستی کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ اسے پڑھنے والوں کا اعتماد حاصل ہو جائے۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ یہ فضا قائم ہو جاتی ہے تو وہ قارئین کے سامنے جی بھر کے دل کی باتیں کرتا ہے۔

شاعری اور بالخصوص غزل کا فن داخلی جذبات کی ترجمانی کا فن ہے۔ لہٰذا شاعر اور قاری کے درمیان ایک جذباتی ہم آہنگی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ انشائیہ نگار بھی اپنی دل چسپ اور پُر لطف باتوں سے قارئین سے براہ راست رشتہ قائم کرتا ہے۔ انشائیہ واعظ یا ناصح کا لبادہ نہیں اوڑھتا بلکہ وہ ایک ہم درد انسان اور مخلص دوست کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ دیگر اصناف کے مصنفین کی طرح ''مقدس سنجیدگی'' کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کی سنجیدگی اور تکلفات کا نقاب اُتار کر بے تکلفی سے اپنی باتیں کہتا ہے۔ وہ کھل کر گفتگو کرتا ہے لیکن اس گفتگو میں وضاحت وصراحت کے بجائے اشاریت ہوتی ہے۔ جس اس کی گفتگو میں کاٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ انشائیہ نگار، نظم نگار شاعر کی طرح ربط وتسلسل کا انداز اختیار کرنے کے بجائے غزل گو شاعر کا انداز اپناتا ہے۔ اسی وجہ سے انشائیہ میں اشاریت، غنائیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے اور اشاریت میں وضاحت کے پہلو چھپے ہوتے ہیں۔

انشائیہ کی اس خصوصیت کی وجہ سے انگریز ناقدین مونٹین انشائیہ کا جوہر اختصار اور عدم تکمیل قرار دیتا ہے۔ انشائیہ درحقیقت ذاتی و شخصی تجربات اوران سے حاصل ہونے والی بصیرتوں کی جلوہ گاہ ہے۔ تجربات واحساسات کی وسعت بے پناہ ہے لہٰذا انشائیہ نگار کے پاس موضوعات کا تنوع ہوتا ہے۔ وہ جو موضوع چاہے منتخب کرسکتا ہے۔ انشائیہ نگار اظہارِ خیال میں آزاد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جانسن نے انشائیہ کو ''غیر منظّم'' ادب پارہ قرار دیا ہے۔ انشائیہ بے شک ذاتی اور شخصی تاثرات کا مرقع ہوتا ہے لیکن یہ خارجی ماحول ہی ہے جو انشائیہ نگار کے قلب و ذہن پر اثر انداز ہوکر اس کے خیالات کو متحرک اور مہمیز کرتے ہیں۔ جو انشائیہ کی تصنیف کے موجب ہوتے ہیں۔ انشائیہ نگار دل اور دماغ دونوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ وہ دلی جذبات کو عقل کی کسوٹی پر کستا ہے اور عقلی دلائل کو جذبات کی سان پر چڑھاتا ہے۔

انشائیہ نگار زاہد خشک نہیں ہوتا۔ زندگی اور اس کی لذتوں سے قربت اور والہانہ لگاؤ اس کے لئے لازمی ہے۔ انشائیہ نگار کی مشاہدہ کی قوت بڑی تیز ہوتی ہے۔ اس کی حس مزاح اعلیٰ درجہ کی چاہیے۔ ان اوصاف کو بروئے کار لاکر انشائیہ نگار خود پر بھی تنقید کرتا ہے اور دوسروں پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتا۔ لیکن اس کی سخت سے سخت تنقید میں بھی شیرینی اور شگفتگی ہوتی ہے۔ اس کے لہجہ میں حلاوت ہوتی ہے، تلخی نام کو نہیں ہوتی۔ انشائیہ نگار باغ و بہار شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ انشائیوں میں جو اسلوب اختیار کرتا ہے وہ سادہ، دل کش اور شگفتہ ہوتا ہے، انشائیہ میں سنجیدگی اور علمی موضوعات بھی دل کش اور شگفتہ انداز میں جگہ پاتے ہیں۔

انشائیہ نگار کسی ادبی نظریے کا پابند نہیں ہوتا وہ ہر عنوان پر خامہ فرسائی کرسکتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچھا انشائیہ نگار رواں دواں آب جو کی مانند ہوتا ہے جس میں صاف و شفاف اور صحت بخش پانی بہتا رہتا ہے۔ انشائیہ نگار کے لئے لازمی ہے کہ اس کی باتوں میں کیف واثر کی چاشنی ہو اور قاری اکتاہٹ کے بجائے دل چسپی محسوس کرے۔ انشائیہ نگار بات کا بتنگڑ نہیں بناتا وہ دماغ پر فکر کا بوجھ نہیں لادتا بلکہ ہلکی پھلکی باتوں سے اپنے مطلب کی بات قاری کے دل تک پہنچادیتا ہے۔

مختصر یہ انشائیہ نگار خشک مزاج واعظ نہیں بلکہ بذلہ سنج ہوتا ہے اور اس کا کام خوش گفتاری کے ذریعہ محفل کو زعفران زار بنانا ہے۔ انشائیہ نگار سنجیدہ موضوع کو غیر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ موضوع کو سنجیدہ موضوع بنانے کے فن میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔

مثلاً: وہ پارلیمنٹ کو اور ہر کا کھیت بنا سکتا ہے اور کتوں کی نوائے سمع خراش کو طرحی غزل میں بدل سکتا ہے۔

غرض کہ انشائیہ اردو ادب کی ایک جدید صنف ہے۔ اور اب تک انشائیہ کو اردو ادب میں وہ مناسب مقام نہیں ملا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ اردو ادب میں انشائیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان ادیبوں کا تخلیق کردہ ہے۔ جو طنز و مزاح کے پیرائے میں اپنے افکار و خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ صنف اپنے اندر بہت وسعت رکھتی ہے۔

03.05 انشائیہ سے متعلق ایک مختلف نقطۂ نظر

انشائیہ ایک صنف سخن ہے۔ چنانچہ دیگر اصناف کی مانند اس کو مختلف رنگ، مختلف طرزِ بیان اور گوناگوں رویّوں کا حامل ہونا چاہیے۔ جس طرح ناول، افسانے اور ڈرامے طنزیہ و مزاحیہ ہوسکتے ہیں۔ اور ایسے ناول، افسانے اور ڈراموں کو ہم صرف اس بنا پر ان کا دائرہ اصنافِ ادب سے خارج نہیں کرسکتے کہ ان میں طنزیہ و مزاحیہ رنگ غالب ہے۔ کبھی کبھی بعض ناقدین ادب کے کسی صنف ادب کے مخصوص رویہ یا رنگ کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ اسے مخصوص رنگ اور انداز سے مختلف انداز والے ادب پاروں کو اس صنف خارج کرنے کی کوشش کرتے

ہیں۔اردوانشائیہ کے سلسلے میں یہ غلط فہمی عام ہے۔مثال کے طور پر ڈاکٹر احسن فاروقی ،نذیر احمد کے ناولوں کو صرف اس بنا پر ناول تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ نذیر احمد کے ناولوں میں تمثیلی رنگ غالب ہے اوران ناولوں کے کردار ٹائپ یا اسم با مسمّٰی ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کا اعتراض اپنی جگہ لیکن ہم نذیر احمد کے ناولوں کو ناول کے دائرے سے خارج نہیں کر سکتے بلکہ ان کے ناولوں کی اس خصوصیت کی وجہ سے انہیں تمثیلی ناولوں کے زمروں رکھ سکتے ہیں۔اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا طنزیہ اور مزاحیہ رنگ والے انشائیوں کو انشائیہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

''جس مضمون میں طنزیہ انداز غالب اور ہنسی کے ذریعہ اصلاح حال مطلوب ہو،اسے ہم طنزیہ مضمون کہیں گے۔ دوسری طرف جس مضمون میں مزاحیہ انداز نمایاں اور آسودگی پہنچانا مقصودِ نظر ہو، اسے مزاحیہ مضمون کا نام دیں گے۔''

(معنی اور تناظر..ڈاکٹر وزیر آغا)

انشائیہ کے سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ نقطۂ نظر ڈاکٹر احسن فاروقی کے نقطۂ نظر کی طرح انتہا پسندانہ ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے استدلال کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ انشائیے سے متعلق ان کا نقطۂ نظر بے حد محدود ہے۔بطورِ مثال جب وہ اردو کے انشائیہ نگاروں کی فہرست مرتب کرتے ہیں تو انہیں صرف چار نام ہی دَست یاب ہوتے ہیں۔لیکن ان چاروں بزرگوں کو بھی وہ مکمل انشائیہ نگار تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ ان کے فن کی تکمیل میں ایک اِنچ کی کسر باقی رہ گئی۔وہ لکھتے ہیں:

''.....ان لکھنے والوں میں ناصر علی دہلوی ،سجاد انصاری،خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد ہی وہ ادیب تھے جن کے یہاں انشائیے کے مخصوص مزاج اور اسلوب کی طرف پیش قدمی کے شواہد ملتے ہیں۔یہ وہ لوگ تھے جو انشائیہ نگار بنتے بنتے رہ گئے۔''

(معنی اور تناظر...ڈاکٹر وزیر آغا)

دراصل انشائیہ سے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا کے اس انتہا پسند نقطۂ نظر کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ خود کو اردو کا اولین انشائیہ نگار ثابت کرنا چاہتے ہیں۔اور یہ کہ پاکستان میں انشائیہ کا محرک وہ خود تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''نصیر آغا (وزیر آغا) کے نام سے اس کا پہلا انشائیہ ''ادبی دنیا'' میں چھپا تھا وہ بطور انشائیہ نگار لکھا ہی نہیں گیا تھا۔البتہ اس کے تین چار برس بعد قیوم نظر کے ایما پر اس نے شعوری طور پر انشائیہ بعنوان ''گرمی'' لکھا اور یہیں سے پاکستان میں انشائیہ نگاری کا ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔''

(معنی اور تناظر..ڈاکٹر وزیر آغا)

ڈاکٹر وزیر آغا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو میں وہ پہلے شخص ہیں جس نے انگریزی لفظ 'Light Essay' کے لئے ''انشائیہ'' لفظ استعمال کیا۔اور اسے اردو میں رواج بھی دیا۔وہ مزید لکھتے ہیں:

''راقم الحروف نے ''ادب لطیف'' کی معاونت سے اس لفظ کو''Light Essay'' کے لئے استعمال کرنے کا آغاز کیا اور خوش قسمتی یہ ہوئی کہ نہ صرف اردو انشائیہ کی تحریک کامیاب ہوئی بلکہ اس کے ساتھ ہی لفظ ''انشائیہ'' بھی مقبول ہوگیا۔''

(معنی اور تناظر..ڈاکٹر وزیر آغا)

حقیقت کی کسوٹی پر ڈاکٹر وزیر آغا کے یہ تمام دعوے غلط ٹھہرتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا سے بہت پہلے اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔اس کی تفصیل ہم آگے پڑھیں گے۔

03.06 اُردو انشائیے کا آغاز وارتقا

کسی موضوع سے متعلق جو خیالات بے ساختہ مصنف کے ذہن میں آتے ہیں انہیں شائستہ،لطیف اور خوش گوار ڈھنگ سے بیان کرنا انشائیہ کی اولین شرط ہے۔درحقیقت منتخب موضوع کے حوالے سے ذہن کی آزاد ترنگ انشائیہ کا جوہر ہے۔ایک کامیاب انشائیہ میں احساس شعریت،حکیمانہ نزاکتیں اور وسعت علم بڑی عمدگی سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں اردو میں انشائیے اردو کے ابتدائی نقوش اور نثر کی پہلی کتاب ملا وجہی کی ''سب رَس'' میں ملتے ہیں۔اس کتاب کے بعض حصوں کو اردو میں انشائیہ کا پہلا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر وجہی عقل کے بارے میں فرماتے ہیں:

''عقل نور ہے،عقل کی دوڑ بہت دور ہے،عقل ہے تو آدمی کہلوائے،عقل ہے تو خدا کوں پائے،عقل اچھے تو تمیز کرلے،برا اور بھلا جانے،عقل اچھے تو اپس کوں ہور دوسرے کوں پہچانے۔عقل کے میر،عقل کے پیر۔عقل کے بادشاہ،عقل کے وزیر۔عقل کے دنیا،عقل کے دولت،عقل کے چلتی سلطاناں کی سلطنت۔عقل کی دہیا ہے جو عالم کھڑا،جس میں بہوت عقل اور بہوت بڑا۔عقل سوں چلتی خدا کی خدائی،جتنی عقل اتنی بڑائی .....عقل بغیر دل کوں نور نئیں،عقل کوں خدا کہنا بھی کچھ دور نئیں۔''

اس طرح کے متعدد نمونے ''سب رَس'' کے صفحات پر جا بجا بکھرے ہوئے ہیں جو انشائیہ کی تعریف پر کھرے اُترتے ہیں۔یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ''سب رَس'' اردو میں انشائیے کی پہلی کتاب نہیں ہے البتہ اس کے صفحات پر جا بجا اردو میں انشائیہ نگاری کے ابتدائی نقوش ضرور بکھرے ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں انشائیہ کے آغاز وارتقا کا ذکر کرتے ہوئے نظیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے آخر میں مغرب کے اثر سے جن چیزوں کے ابتدائی نقوش اردو ادب میں اُبھرے ان میں انشائیہ بھی ہے۔سرسید کا مضمون ''امید کی خوشی''،منشی سجاد حسین اور ''اودھ پنچ'' کے دوسرے قلمی معاونین کے مزاحیہ خاکے اردو میں انشائیہ نگاری کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں،شرر لکھنوی،سجاد حیدر یلدرم ،خواجہ حسن نظامی،فرحت اللہ بیگ،رشید احمد صدیقی،پطرس بخاری،شوکت تھانوی،کنہیّا لال کپور،شفیق

الرحمٰن،کرشن چندر،سعادت حسن منٹو،ابراہیم جلیس،امجد حسین، وزیرآغاان تمام ادیبوں کے یہاں اچھے اورقابل قدرانشائیے ملتے ہیں۔''

(مضمون انشائیہ کیا ہے؟..نظیرصدیقی)

اردوانشائیہ کانقطۂ آغاز ہم سرسید کوتسلیم کرسکتے ہیں۔

سرسید کامضمون ''امید کی خوشی''انشائیہ کی تعریف پرکھرا اُترتا ہے۔''امید کی خوشی''میں سرسید کاانداز بیان پوری طرح شخصی ہے اور بیان کی سادگی وشگفتگی کے باوصف اس مضمون کوناقدینِ ادب نے بجاطور پراردو کاپہلا انشائیہ قراردیا ہے۔

سرسید کے رفقاء میں محمد حسین آزادغیرمعمولی ذہانت کے انشاء پرداز تھے۔ان کی کتاب ''نیرنگِ خیال''انشائیہ نگاری کی تمام شہرتوں اورتقاضوں پرکھری اُترتی ہے۔''نیرنگِ خیال''میں شامل مضمون ''شہرت عام اور بقائے دوام کادربار''اپنے اندرانشائیہ کا سارا حسن اور لطافت رکھتا ہے۔اسی طرح ''نیرنگ خیال'' کے دیگرمضامین بھی انشائیے کے تقاضوں پرکھرے اُترتے ہیں۔اس اعتبار سے محمد حسین آزادکی ''نیرنگ خیال''اردو میں انشائیہ مضامین کی پہلی کتاب قرار پاتی ہے۔

معروف ناول نگارعبدالحلیم شررنے بعض عمدہ انشائیہ لکھ کراردوانشائیہ کے کارواں کوآگے بڑھایا۔ان کے انشائیے مثلاً''مغرور جوتا'' اور''ہمارے شعرا کامعشوق''وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کے بیان میں ندرت،لطافت اورخوش آہنگی ہے۔

ابتدائی دور کے انشائیہ نگاروں میں حسن نظامی بھی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔انہوں نے سیکڑوں انشائیے تخلیق کیے۔ان کے انشائیوں کےعنوانات بے حددل چسپ ہیں اور یہ اشارہ کرتے ہیں کہ یہ مضامین انشائیوں کے سوا کچھ اورنہیں ہوسکتے۔مثال کےطور پران کے چندانشائیوں کے شوخ عنوانات دیکھیے:''مچھر،مکھی،الّو،انگلی کا کشف،مٹی کا تیل،دیاسلائی،برف،اُوس،ایک پیسہ،لال ٹین'' اور ''اینٹ چونے کاوصال''وغیرہ۔

حسن نظامی کے چندانشائیوں کےظریفانہ عنوان بھی دیکھیے:''موسمی دعائیں،دعائے بےقراری،مست الست کی دعا،دل آشفتہ کی بکاوزاری،جھولی والے فقیرکی بھیک وغیرہ۔اس کے علاوہ حسن نظامی کے انشائیوں مزیدعنوانات یوں ہیں:طائرسبزفام کا پیام،بندوں کی دعااورتوہی ہےاے خداوغیرہ۔

سجادحیدریلدرم نے زیادہ انشائیہ نہیں تصنیف کیے۔چنانچہ ان کا ایک ہی انشائیہ دَست یاب ہے۔جس کاعنوان ہے''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''۔سجادحیدریلدرم کاایک انشائیہ ہی انہیں اچھے انشائیہ نگاروں کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے۔غرض کہ وقت کےگزرنے کے ساتھ ساتھ انشائیہ کافن اردو میں ترقی کرتارہا۔نئے انشائیہ نگار بیسویں صدی کے قافلے میں شامل ہوتے رہے۔اوراپنے انشائیوں سےاردوانشائیے کےسرمائے میں اضافہ کرتے رہے۔

بیسویں صدی میں انشائیہ نگاروں ایک مختصرفہرست ترتیب دی جائےتواس فہرست میں فرحت اللہ بیگ،مولاناابوالکلام آزاد،رشید احمدصدیقی، مہدی افادی،سجاد انصاری، پطرس بخاری،شوکت تھانوی،ناصرعلی دہلوی،شفیق الرحمٰن،کرشن چندر،سعادت حسن منٹو،ابراہیم جلیس،مشتاق احمد یوسفی،یوسف ناظم،مجتبیٰ حسین کےعلاوہ دیگراچھے انشائیہ نگاریقیناً جگہ پائیں گے۔

مذکورہ تمام انشائیہ نگاروں نے اپنے فکروفن سے اردو میں اس فن کو بالیدہ کیا اور اس صنف کو اعتبار، وقار اور مقبولیت عطا کی۔ عہدِ حاضر کے انشائیہ نگاروں میں دلیپ سنگھ، شفیقہ فرحت، پرویز اللہ مہدی، نریندر لوتھر، مسیح انجم، نصرت ظہیر، حبیب ضیاء، فیاض فیضی وغیرہ قابل ذکر انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے عہدِ رواں میں اس صنف کو اپنے فن کی جولاں نگاہ بنایا ہے۔

03.07 خلاصہ

انگریزی زبان کے لفظ ''Personel Essay'' یا ''Light Essay'' کے لئے اردو میں انشائیہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے انشائیہ میں انشائیہ نگار دل چسپ، فطری اور شگفتہ انداز میں اپنے ذاتی اور شخصی تاثرات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔

انشائیہ کی تعریف انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں یوں درج ہے:

''(انشائیہ) اوسط لمبائی کا نثری مضمون، جس میں سہل اور سرسری انداز میں صرف اس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔''

انشائیہ میں انشائیہ نگار کے ذاتی تجربات واحساسات کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے مشاہدات اور گردوپیش کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو ذاتی اور شخصی تجربہ بنا کر اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس میں مصنوعی انداز نام کو نہیں ہوتا۔ غرض کہ بے تکلفی، سادگی، شستگی اور شگفتگی انشائیہ کے اہم اوصاف ہیں۔ انشائیہ نگار سنجیدگی کا لبادہ نہیں اوڑھتا بلکہ حکمت وفلسفہ کی باتیں بھی سادہ اور خوش گوار انداز میں بیان کر دیتا ہے۔

اردو زبان میں انشائیہ کے اولین نقوش اور دونثر کی پہلی کتاب مُلّا وجہی کی ''سب رَس'' میں ملتے ہیں۔ دورِ جدید میں سرسید احمد خاں کو اُردو پہلا انشائیہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کے مضمون ''امید کی خوشی'' کو اردو کا پہلا انشائیہ۔ سرسید کے رفیق کار محمد حسین آزاد کی تصنیف ''نیرنگِ خیال'' اردو انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں کئی عمدہ انشائیے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ عبدالحلیم شرر اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ دیگر انشائیہ نگاروں نے بھی عمدہ انشائیے تصنیف کر کے اس صنف کے فروغ میں حصہ لیا۔ آگے چل کر ناصر علی دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مہدی افادی، پطرس بخاری، سجاد انصاری، شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، کنھیّا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین وغیرہ اہم انشائیہ نگار قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

03.08 فرہنگ

آسودگی	: سکون	سرشت	: مزاج
آمیزش	: ملاوٹ	شمولیت	: شامل ہونا
آہنگ	: نغمگی	طرز	: بیان کا انداز
احتراز	: پرہیز	عدم تکمیل	: نامکمل، ادھورا
اختصار	: مختصر	غیر منظّم	: جو کسی اصول کا پابند نہ ہو
استدلال	: دلائل	کلیدی	: بنیادی

اسرارورموز	: پوشیدہ راز	لبادہ	: لباس
اسلوب	: بیان کاانداز	مرقع	: تصویر
اسم بامسمّٰی	: جیسانام ویسےاوصاف	مرقع نگاری	: لفظوں کی مدد سےتصویر کھینچنا
بذلہ سنج	: ہنس مکھ	مماثل	: مثل، مانند
پیچ وخم	: الجھاؤ	مہمیز	: رفتاردینا
پیچیدہ	: مشکل، الجھاہوا	ناصح	: نصیحت کرنے والا
تخاطب	: خطاب	نوائے سمع خروش	: کانوں کو بری لگنے والی آواز
جولانیِ طبع	: طبیعت کی تیزی	واعظ	: وعظ کہنے والا
حلاوت	: مٹھاس	وسعت	: پھیلاؤ
ذہن نشین	: یاددلانے والا	وضاحت وصراحت	: بات کوکھول کرکہنا
رائج	: رواج پایاہوا	یکسانیت	: ایک جیسا

03.09 سوالات

مختصرسوالات

سوال نمبر۱ انشائیہ کیسے کہتے ہیں؟

سوال نمبر۲ انشایئے کی اہم صفات کیا ہیں؟

سوال نمبر۳ کس انشائیہ نگار نے انشائیوں کوغزل کے مماثل قرار دیا ہے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ انشایئے کی اہم خصوصیات سے بحث کیجیے۔

سوال نمبر۲ ایک انشائیہ نگار کوکن صفات کا حامل ہونا چاہیے؟ بحث کیجیے

سوال نمبر۳ انشایئے کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے فن پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : ''تصنع'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) بناوٹ (ب) فطرت (ج) حقیقت (د) کچھ نہیں

سوال نمبر۲ : ''ناقدین'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) نقد (ب) ناقد (ج) نقدی (د) نقدیہ

سوال نمبر۳ : ''موقع'' کی جمع کیا ہے؟

(الف) وقوع (ب) وقعت (ج) واقعہ (د) مواقع

سوال نمبر۴ : ''اتفاق'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) خلف (ب) خلیفہ (ج) اختلاف (د) مختلف فیہ

سوال نمبر۵ : ''انشائیہ'' کس قسم کی تحریر ہوتی ہے؟

(الف) منظوم (ب) نثری (ج) دونوں (د) کوئی نہیں

سوال نمبر۶ : ''انتشار'' کس صنف کی خصوصیت ہے؟

(الف) انشائیہ (ب) مضمون (ج) خاکہ (د) سوانح

سوال نمبر۷ : ''معنی اور تناظر'' کس کی کتاب ہے؟

(الف) پریم چند (ب) گوپی چند نارنگ (ج) وزیر آغا (د) کنور مہندر سنگھ

سوال نمبر۸ : ''مغرور جوتا'' کس کا انشائیہ ہے؟

(الف) پطرس بخاری (ب) مشتاق احمد یوسفی (ج) کنہیالال کپور (د) عبدالحلیم شرؔر

سوال نمبر۹ : اِن میں سے کون انشائیہ نگار ہے؟

(الف) میر تقی میرؔ (ب) رشید احمد صدیقی (ج) سراجؔ اورنگ آبادی (د) ولؔی دکنی

سوال نمبر۱۰ : ''مست اَلست کی دعا'' کس کا انشائیہ ہے؟

(الف) مشتاق احمد یوسفی (ب) پطرس بخاری (ج) خواجہ حسن نظامی (د) رشید احمد صدیقی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (الف) بناوٹ	جواب نمبر۶	: (الف) انشائیہ
جواب نمبر۲	: (ب) ناقد	جواب نمبر۷	: (ج) وزیر آغا
جواب نمبر۳	: (د) مواقع	جواب نمبر۸	: (د) عبدالحلیم شرؔر
جواب نمبر۴	: (ج) اختلاف	جواب نمبر۹	: (ب) رشید احمد صدیقی
جواب نمبر۵	: (ب) نثری	جواب نمبر۱۰	: (ج) خواجہ حسن نظامی

03.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو نثر کا فنی رتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۲۔ صنف انشائیہ اور انشائیے از ڈاکٹر سید محمد حسین

۳۔ معنی اور تناظر از ڈاکٹر وزیر آغا

اکائی 04 اُردو کے اہم انشائیہ نگار

ساخت

04.01 : اغراض ومقاصد

04.02 : تمہید

04.03 : محمد حسین آزاد

04.04 : خواجہ حسن نظامی

04.05 : مرزا فرحت اللہ بیگ

04.06 : رشید احمد صدیقی

04.07 : خلاصہ

04.08 : فرہنگ

04.09 : سوالات

04.10 : حوالہ جاتی کتب

04.01 اغراض ومقاصد

اردو نثر کی ایک اہم صنف انشائیہ کے فن سے متعلق آپ پچھلی اکائی میں تفصیل سے مطالعہ کر چکے ہیں۔ پیش نظر اکائی میں آپ اردو کے چند اہم مشہور ومعروف انشائیہ نگاروں کی حیات وخدمات سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ اس اکائی کا مقصد آپ کو اردو کے اہم انشائیہ نگاروں کی زندگی کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف کرانا ہے۔ اس کے تحت آپ انشائیہ نگاروں کی زندگی کے حالات، ان کی ادبی خدمات اور انشائیہ نگاری سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے۔ نیز ان کی تصنیف کردہ اہم انشائیوں کے اقتباسات بھی بطورِ نمونہ ملاحظہ کریں گے۔

04.02 : تمہید

انشائیہ کی صنف اردو نثر کی جدید اصناف میں شمار ہوتی ہے۔ اردو میں انشائیہ انگریزی سے آیا۔ انگریزی میں انشائیہ کو ''Essay'' یا ''Light or Personal Essay'' بھی کہتے ہیں۔ انشائیہ نگار کسی بھی موضوع کو اظہارِ خیال کے لئے منتخب کر سکتا ہے۔ وہ بے تکلف، بے ساختہ اور غیر علمی انداز میں شگفتگی اور ندرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات کرتا ہے۔ اور اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اپنے تاثرات بیان کرتا ہے۔ اس سامنے کوئی اصلاحی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دل کی باتیں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ اس کی باتیں ایسی دل نشیں ہوتی ہیں اور ان میں ایسی چاشنی گھلی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کو ایک نئی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

انشائیہ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ انشائیہ نگار کے تجربے اور مشاہدے زندگی پر ایک نئے زاویئے سے روشنی ڈالتے ہوں اور اس زاویۂ نظر میں اس کی اپنی ذات اور شخصیت کا بھی انکشاف ہوتا ہو۔ سرسید کا مضمون ''امید کی خوشی'' کو اردو کا پہلا انشائیہ قرار دیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں کے بعد محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی، سجّاد حیدر یلدرم، فرحت اللہ بیگ، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، مہدی افادی، پطرس بخاری، سجّاد انصاری، شوکت تھانوی، ناصر علی دہلوی، شفیق الرحمٰن، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور کنھیّا لال کپور وغیرہ اردو کے معروف انشائیہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جنھوں نے اردو انشائیے کے سرمائے میں اپنی تصنیف سے اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ عہدِ حاضر کے انشائیہ نگاروں میں دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، مسیح انجم، شفیقہ فرحت، پرویز اللہ مہدی، حبیب ضیاء، نصرت ظہیر، حلیمہ فردوس اور عابد معز وغیرہ اہم انشائیہ نگار ہیں۔

صنف انشائیہ کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ اس میں مواد اور ہیئت دونوں پر انشائیہ نگار کی شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کے خیالات، احساسات، جذبات و تاثرات کو اصولوں اور پابندیوں کی بیڑیوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ انشائیہ کو ذہن کی ''آزاد ترنگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا انشائیہ نگار کے تاثرات کی رَو کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔ اسی سبب سے انشائیہ کو غیر منظّم ادب پارہ بھی کہا جاتا ہے۔

ماہرینِ ادب نے سرسید کے مضمون ''امید کی خوشی'' کو اتفاق رائے سے اردو کا پہلا انشائیہ تسلیم کیا ہے۔

انشائیہ ''امید کی خوشی'' سے ایک اقتباس طلبا کے لئے پیش ہے:

> ''دیکھ نادان بے بس بچہ جو گہوارہ میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لورتی دیتی ہے۔ سورَہ میرے بچے سورَہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورَہ، اے میرے دل کی کونپل سورَہ، بڑھ اور پھل پھول تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے، تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے، سورَہ میرے بچے سورَہ، تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا، تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا ہمارے دل کو تسلّی دے گی۔ سورَہ، میرے بچے سورَہ! میرے بالے سورَہ!''
>
> (انشائیہ ''امید کی خوشی'')

اس اکائی میں آپ محمد حسین آزاد، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری کی کے متعلق تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

04.03 محمد حسین آزاد

﴿۱﴾ مختصر حالاتِ زندگی: آپ کا نام محمد حسین اور تخلص آزاد تھا۔ محمد حسین آزاد کے والد کا نام محمد باقر تھا۔ محمد حسین آزاد دہلی کے رہنے والے تھے۔ آزاد کی پیدائش ۱۰ر جون ۱۸۳۰ء بروز جمعرات دہلی میں ہوئی۔ آزاد کے والد محمد باقر اور اردو کے مشہور شاعر شیخ ابراہیم ذوقؔ کے درمیان ایسی مثالی محبت تھی کہ جیسی حقیقی بھائیوں کے درمیان ہوتی ہے۔ جب آزاد نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد محمد باقر نے انہیں تعلیم و

تربیت کی غرض سے ذوق کے سپرد کردیا۔ ذوق نے اپنی اولاد کی طرح آزاد کی تربیت کی۔ بعد میں آزاد نے دلّی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں مولوی نذیر احمد، ذکاءاللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب جیسے اہل علم نے تعلیم حاصل کی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دہلی کے باشندوں کی طرح آزاد پر بھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مولوی محمد باقر بغاوت کے الزام میں انگریزوں کے ذریعے شہید کردیئے گئے۔ آزاد کا گھر بار اور مستقبل سب کچھ تباہ و برباد ہوگیا۔ وہ ایک عرصے تک محفوظ جائے پناہ کی تلاش میں دربدر پھرتے رہے۔ بے سروسامانی کے عالم میں آزاد کی نگاہوں میں دنیا ویران ہوگئی۔ انگریزی حکومت انہیں بھی شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ آزاد مختلف مقامات پر پھرتے ہوئے آخر میں لاہور پہنچے۔ اسی زمانے میں ملکۂ برطانیہ نے عام معافی کا اعلان کیا۔ لاہور میں آزاد کو عافیت نصیب ہوئی۔ آزاد یہاں سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپئے ماہ وار پر ملازم ہوگئے۔ لاہور میں آزاد کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ ان کی شہرت روز بروز پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ انہیں حکومت پنجاب کے اعلیٰ افسروں کا اعتماد حاصل ہوگیا۔ چنانچہ صوبۂ پنجاب کی انگریزی حکومت نے آزاد کو ''قصصِ ہند'' اور بچوں کو لئے مختلف ریڈریں تیار کرنے کا کام تفویض کیا۔ چنانچہ آزاد نے فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب اور اردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب بچوں کے لئے تیار کی۔ جنہیں قبول عام کی سند حاصل ہوئی۔ اور پنجاب میں اسکولی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ آزاد اب حکومت کے چہیتے بن گئے یہاں تک کہ ایک مرتبہ انہوں نے حکومت کی جانب سے کابل اور بخارا کا بھی سفر بھی کیا۔ پنجاب میں انگریزی حکومت کی حمایت اور آزاد کی کوششوں سے ہی ''انجمن پنجاب'' کی داغ بیل پڑی۔ اور اردو ادب میں ایک نئی قسم کی شاعری یعنی نظم نگاری کا آغاز ہوا۔ غرض کہ اردو میں نظم جدید کے آغاز کا سہرا محمد حسین آزاد کے سر ہے۔

صوبۂ پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیم کرنل ہالرائیڈ نے آزاد کو ایک سرکاری اخبار ''اتالیق پنجاب'' کا سب ایڈیٹر مقرر کردیا اور ان کا مشاہرہ ۷۵/روپیہ ماہ وار مقرر ہوا۔ بعد میں اس اخبار کی اشاعت بند ہونے پر آزاد ''پنجاب میگزین'' کے بھی سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ آزاد اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ ۱۸۸۷ء میں انگریزی حکومت نے آزاد کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ''شمس العلما'' کا خطاب عطا کیا۔ اسی دوران جوان بیٹی کی موت نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا اور ۱۸۸۹ء میں انہیں جنون ہوگیا۔ آخر اس کیفیت میں ۲۲/جنوری ۱۹۱۰ء کو آزاد اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

﴿۲﴾ محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری: محمد حسین آزاد کی علمی و ادبی صلاحیتیں بے پناہ تھیں۔ انہوں نے یونانی اور انگریزی ادب کے اثر سے اردو میں ایسے اخلاقی اور اصلاحی مگر دل چسپ مضامین کی بنیاد ڈالی جنہیں بجا طور پر ناقدین نے انشائیہ تسلیم کیا ہے۔ یہ مضامین اُردو کے لئے ایک نئی چیز تھے۔ آزاد نے ان تمام مضامین کو ''نیرنگِ خیال'' میں جمع کردیا۔ ''نیرنگِ خیال'' کو اردو میں انشائیوں کا پہلا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل کے مطابق:

> ''آزاد کی نیرنگ خیال..... مضمون اور تحریر دونوں لحاظ سے بہت دل چسپ ہے۔ یہ اور بھی قابل داد ہے کہ آزاد انگریزی علم سے بہت کم واقف تھے۔ مگر اس کے کتاب کے لکھنے میں انگریزی ادب کی پوری پیروی کی۔ بلکہ زیادہ تر مضامین انگریزی انشا پردازوں سے لیے ہیں۔ تاہم ان میں اردو کی وہ چاشنی اور فضا پیدا کردی ہے کہ اب یہ سارے مضامین آزاد کے ہوگئے ہیں۔''
>
> (مختصر تاریخ ادب اردو ص ۳۲۱ ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

محمد حسین آزاد ایک ادیب وشاعر کا ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے۔انہوں نے جس میدان میں قدم رکھا اپنے کارناموں کے یادگار نقوش چھوڑے۔ان کی نثری تحریریں ان کی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ان کی تحریروں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ بے تکان،قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔بقول پروفیسر سید محمد عقیل مذکورہ کتاب کے صفحہ ۳۲۱ پر لکھتے ہیں:

''آزاد کے قلم کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ مواد خواہ کتنا ہی کم ہو،صفحے کے صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں اور تاثیر و لطف میں کوئی کمی نہیں آتی۔ان کی عبارت کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ تحریر میں لوچ اور موقع پر زور بھی خاص طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔گویا اب کمان میں دو تیر ہر وقت رہتے ہیں جس سے دل پر چوٹ کی جاسکتی ہے..... آزاد کا قلم سوز و گداز کی تصویر اس خوبی سے اُتارتا ہے کہ نثر میں شعر کا درد و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔وہ رنگین کی نثر لکھنے کے ماہر تھے۔اسی طرز نگارش نے انہیں صاحب طرز ادیب بنایا۔''

(مختصر تاریخ ادب اردو ص ۳۲۱ ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

آزاد کی انشائیہ پردازی نے تمام ناقدین سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

ان کی طرزِ نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''.....وہ ہر چیز جس نے ان کو زندۂ جاوید کر دیا وہ ان کا خاص طرزِ تحریر ہے جو لاثانی ہے اور جس کی تقلید محال ہے۔زبان اردو نے ان کی ذات میں اپنا ایک بہت بڑا مددگار اور حامی پایا تھا۔ان کے طرزِ تحریر کی یہ خاص صفت ہے کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اور دُور از کار صنائع بدائع جن کا آج کل بہت رواج ہے اس میں نہیں پائے جاتے۔ان کی عبارت کی یہ خاص شان ہے کہ بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی،انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی حسن و خوب صورتی اس میں ملی جلی ہوتی ہے۔وہ تصنعات و تکلفات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے اور خوب صورت تشبیہیں حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔وہ ایک موسیقیت رکھتی ہیں۔آزاد کا مقابلہ انگریزی انشاپردازوں میں ڈی ،کوئینسی لیمب اور اسٹیونسن سے جو صاحبان طرز خاص تھے بخوبی ہوسکتا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو،ص ۳۱۴،رام بابو سکسینہ،مترجم مرزا محمد عسکری)

''نیرنگ خیال'' آزاد کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جس کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں آٹھ جب کہ دوسرے حصے میں پانچ انشائیے شامل ہیں۔نیرنگ خیال کی ابتدا میں آزاد کا ''دیباچہ'' اور ایک مضمون بعنوان ''اردو اور انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات'' بھی شامل ہیں۔ اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے آزاد کے منفرد اور مخصوص اسلوب اور ان کے نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔آزاد سے قبل اُردو میں انشائیوں کا وجود نہیں تھا۔چنانچہ یہ سوال بے حد دل چسپ ہے کہ آزاد کے انشائیوں کا ماخذ کیا ہے؟اس سوال کے جواب دیتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

''نیرنگ خیال میں جتنے مضمون شامل ہیں یہ دراصل انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ان میں چھ مضمون جانسن کے ہیں، تین ایڈیشن کے اور بقیہ دوسرے انگریزی ادیبوں کے۔لیکن ان ترجموں میں آزاد نے اپنی ذہانت اور سحر بیانی سے اتنارڈ وبدل کردیا ہے کہ ان کا ترجمہ سے بڑھ کر ہوگیا ہے۔''

(نیرنگ خیال...تعارف...مالک رام)

آزاد کے انشائیوں کا ماخذ انگریزی کے انشایئے ہیں۔لیکن یہ بات ذہن نشیں رہے کہ آزاد انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔اس لئے وہ لفظی ترجمہ نہیں کرسکتے تھے۔لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ انہوں نے یہ مضامین کسی سے پڑھوا کر سنے ہوں اور ان کے معانی ومطالب تک رسائی حاصل کر کے ان سے استفادہ کیا ہو۔آزاد نیرنگ خیال کے دیباچہ میں اعتراف کرتے ہیں:

''اے جواہرزبان کے پرکھنے والوں! میں زبان انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ اردو کے میدان میں بھی سوار نہیں پیادہ ہوں ۔اس لئے یہاں بھی درماندہ ہوں۔ پھر بولہوسی دیکھو کہ شہ سواروں کے دوڑنے کو آمادہ ہوں ۔ جتنا نالائق ہوں، اتنا ہی زیادہ شائق ہوں، دل سے لاچار ہوں کہ باوجود موانع مذکور کے جو لطف طبیعت کو بعض مضامین انگریزی سے حاصل ہوا۔نہ چاہا کہ اپنے پیارے اہل وطن کو اس میں شامل نہ کروں۔جس قدر ہوسکے اور جس طرح ہوسکے ایک پرتو اردو میں رکھنا چاہیے......یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔''

(دیباچہ..نیرنگ خیال محمد حسین آزاد)

آزاد کے اس اعتراف کو مدنظر رکھتے ہوئے نیرنگ خیال کے انشائیوں کو ترجمہ نہ کہہ کر انگریزی انشائیوں سے استفادے کا نام دیا جائے تو بہتر ہے۔کیوں کہ نیرنگِ خیال کے انشایئے اپنی ساخت اور مواد کے اعتبار سے خالص اردو کے انشایئے ہیں۔البتہ خیال کی سطح پر انہوں نے انگریزی سے استفادہ کیا ہے۔

﴿۳﴾محمد حسین آزاد کے انشایئے:۔

ذیل میں آزاد کے انشائیوں کے چند اقتباسات بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔جس سے ان کے طرز اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

﴿انشائیہ نمبرا﴾''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا''

اس انشائیہ میں آزاد ایک دل چسپ لطیفہ کی مدد سے اپنی بات شروع کرتے ہیں اور اخلاقی واصلاحی نکتہ بیان کرتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے اپنی گفتگو کو ڈرامائی رخ دیکر اس ہنرمندی سے افسانے سے ملادیتے ہیں تاکہ وہ اپنی بات آسانی سے پڑھنے والوں کو ذہن نشین کراسکیں۔

''سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کردیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔''

''ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے، تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا تھا۔''

''میں ان دنوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب وتکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان کے میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔''

''ایک شخص سوکھا سہما، دبلا پے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا، اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا جس کا دامن دامنِ قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنات کی تصویریں زردوزی سے کڑھی ہوئی تھیں..... جب وہ ہوا سے لہراتی تھی، تو ہزاروں عجیب و غریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی، مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقام مقررہ لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھ کے نیچے گڑگڑاتا دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔''

﴿انشائیہ نمبر۲﴾ ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار''

اس انشائیے کا آغاز بھی ایک حکیمانہ نکتہ سے ہوتا ہے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا مصنف نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے اور خواب دیکھنے میں محو ہو جاتا ہے:

''اے ملک فنا کے رہنے والو! دیکھو اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں جنہوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں جنہیں اسی ہاتف غیبی کا خطاب زیبا ہے جس کے الہام سے وہ مطالب غیبی ادا کرتا رہے اور بے عیبی سے زندگی سے بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزم تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔ بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بتاتے رہے، جس سے ملک فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔''

''خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے یہاں پر وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں۔ جس کی وسعت اور دل افزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انہیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے، نہ قلم تحریر کر فہرست تیار کر سکتا ہے۔ اور لوگ اس میں جمع ہیں، وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے۔ جس کی چوٹیاں گوش سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھ، ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمتے تھے۔ ہاں حضرت انسان کے ناخنِ تدبیر کچھ کام کر جائیں، تو کر جائیں۔ میرے دوستو اس رستہ کی دشواریوں کو سر پھوڑ اور سینہ توڑ پہاروں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں مگر نری نامنصفی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لے، تو ان بلاؤں کو جھیلے۔

جن پر وہ مصیبتیں گزریں وہی جانیں۔ یکا یک قلّہ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دل کش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی ،اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی، جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے۔جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔''

04.04 خواجہ حسن نظامی

﴿۱﴾ مختصر حالاتِ زندگی: اردو کے جدید ادب میں خواجہ حسن نظامی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے سوانحی حالات اپنی خودنوشت سوانح عمری ''آپ بیتی'' میں تحریر کر دیے ہیں۔خودنوشت سوانح عمری تحریر کر کے انہوں نے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔خواجہ حسن نظامی ''آپ بیتی'' میں اپنے حالات درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا نام علی حسن عرف حسن نظامی ہے۔ پیدائش کا مقام بستی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء پرانی دہلی ہے،اور وہی آج کل اقامت ہے،معاش کتابوں اور دواؤں کی تجارت پر ہے۔''

(آپ بیتی....خواجہ حسن نظامی)

آگے چل کر خواجہ حسن نظامی اپنی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تیرہویں صدی کے خاتمہ کے قریب ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں ۲ر محرم جمعرات کے دن صبح صادق کے وقت حسن نظامی پیدا ہوا۔فارسی کی چند معمولی کتابیں پڑھیں۔اس کے بعد عربی صرف ونحو شروع کی (انگریزی بالکل نہیں آتی، بڑی عمر میں کوشش کی ،مگر حاصل کچھ نہ ہوا) بارہ سال کی عمر تھی کہ ایک ہی سال کے اندران کے والدین کا انتقال ہوگیا۔اور اس کی پرورش اس کے بڑے بھائی مرحوم سید حسن علی شاہ نے کی۔''

اپنی زندگی کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی اپنی شادی اور ابتدائی دور کی پریشانیوں اور سفر وغیرہ کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

''قصۂ مختصر ۱۹۰۸ء تک حسن نظامی کی زندگی.....مضامین نویسی ،تصنیف وتالیف، خدمت مریدین میں صرف ہوئی اور ہر سال خدائے تعالیٰ کی عنایت سے اس کے کاموں میں ترقی ہوتی گئی، مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی، تالیفات وتصنیفات چالیس سے زیادہ ہوگئیں۔''

(آپ بیتی.خواجہ حسن نظامی)

مندرجہ بالا اقتباس میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنی تصنیفات وتالیفات کی تعداد میں چالیس بتائی ہے جب کہ اس وقت خواجہ صاحب بقید حیات تھے۔اس کے بعد بھی ان کے قلم سے متعدد کتابوں کی تصنیف کا کام انجام پایا۔اور مریدین کی تعداد خدا معلوم کتنی ہوگی۔ خواجہ صاحب کثیر التصانیف ادیب تھے۔انہوں نے جتنی کتابوں کی تصنیف کی شاید اردو کے کسی دوسرے اہل قلم نے نہیں کی۔

''آپ بیتی'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''پہلے ہر مہینے ایک کتاب تیار ہو جاتی تھی۔''

خواجہ حسن نظامی کی عمر صرف گیارہ برس تھی کہ ان کے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا۔تو بڑے بھائی نے ان کی کفالت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی لیکن خواجہ صاحب بچپن سے ہی بڑے غیور تھے۔چنانچہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے۔ ان کا بچپن کسی قدر محرومیوں اور تنگ دستی میں گزرا۔ان کے خاندان کا تعلق حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ سے تھا۔درگاہ پر جو نذرانے آتے تھے اس میں ان کے خاندان کا بھی حصہ ہوتا تھا۔لیکن وہ بچپن سے ہی نذرانے کی دولت کو محنت کی سوکھی روٹی سے کم تر جانتے تھے۔انہیں لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔حصول معاش کے لئے کتابوں کی تجارت میں بھی قسمت آزمائی کی۔خواجہ حسن نظامی رفتہ رفتہ اخبارات ورسائل میں ہلکے پھلکے مضامین لکھنے لگے۔۱۹۰۸ء میں انہوں نے ''نظام المشائخ'' کے نام سے ایک رسالہ کا اجرا کیا۔جس میں مختلف موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

مصر وشام اور حجاز وغیرہ کے سفر کے درمیان انہوں نے روزنامچہ نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔یہ روزنامچہ جب ''نظام المشائخ'' میں شائع ہوا تو اسے قبول عام کی سند حاصل ہوئی۔بعد میں قارئین کے اصرار پر یہ روزنامچہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔انہوں نے اپنی زندگی میں کئی رسائل وجرائد شائع کیے۔جن میں ''تبلیغِ نسواں''، ''غریبوں کا اخبار''، ''پیر بھائی''، ''درویش'' اور ''منادی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں

خواجہ حسن نظامی کی زندگی میں پابندیِ وقت کی بہت اہمیت حاصل تھی۔وہ ہر کام وقت انجام دینے کی کوشش کرتے تھے۔ان کا معمول تھا کہ رات کے تین بجے سے صبح تک تصنیف وتالیف کا کام کیا کرتے تھے۔خواجہ صاحب ایک ساتھ کئی کتابوں کی تصنیف کی کام کرتے تھے اور ہر کتاب کے لئے دن میں علیحدہ وقت مقرر کر دیئے اور سختی سے اس کی پابندی کرتے تھے۔تصنیف وتالیف کے علاوہ خواجہ حسن نظامی کو سیر و سیاحت کا بھی شوق تھا۔وہ مزاجاً صوفی تھے۔ان کے خاندان کا تعلق سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی کی درگاہ سے تھا۔غیر مسلموں کی عبادت گاہیں دیکھنے اور ان کے مذہب اور روایات کا مطالعہ ومشاہدہ کرنے کی غرض سے انہوں نے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان سادھوؤں کا لباس زیب تن کر کے انہوں نے متھرا، اجودھیا، بنارس، ہری دوار، گیا اور رشی کیش وغیرہ کے ہندوؤں کے مقدس مذہبی مقامات کی زیارت کی اور اس مذہب کے عالموں سے تبادلۂ خیال بھی کیا۔ان کے اس عمل کی بعض حلقوں کی جانب سے مخالفت بھی کی گئی۔اور ان پر کفر کا فتویٰ بھی عائد کیا گیا۔اصلاح معاشرہ کے جذبہ کے تحت خواجہ صاحب نے ۱۹۲۵ء میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔جس کے انتظامات کے لئے انہوں نے اپنی جائیداد بھی وقف کر دی۔خواجہ حسن نظامی نے تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں ایک گرلس اسکول بھی قائم کیا۔برطانوی حکومت نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔۳۱/جولائی ۱۹۵۵ء کو عیدالاضحیٰ کے دن ان کا انتقال ہو گیا۔انہوں ایک بھرپور بامقصد اور باعمل زندگی گزاری۔

﴿۲﴾ **خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری:** ''سیپارۂ دل'' اور ''چٹکیاں گدگدیاں'' خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کے دو مجموعہ ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے انشائیوں میں معاشرت، تصوف اور اخلاق جیسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا تھا۔کائنات ان کے لئے ایک وسیع کائنات کی حیثیت رکھتی تھی۔خواجہ حسن نظامی صاحب کو اظہار خیال کے لئے موضوع کی تلاش

میں سرگرداں نہیں ہونا پڑتا تھا۔ بلکہ کائنات کا کوئی مظہر اور انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو یا گوشہ ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکتا تھا۔ ایک ماہر انشائیہ نگار کی طرح وہ بے جان چیزوں مثلاً دیا سلائی، تنکا، برف اور لالٹین وغیرہ کو با آسانی اپنا موضوع منتخب کر لیتے اور اس خوبی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے کہ قاری پر حیرت کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی۔

''سیپارۂ دل'' کے مضامین میں خواجہ صاحب ہمیں زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا کراتے ہیں۔ اس کتاب کے صفحات پر ہمیں وہ مختلف گلی کوچوں کی سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں وہ دوسرے سے ہم کلام ہیں تو کہیں خود کلامی کی کیفیت ان پر طاری ہے۔ کہیں ان کا تخیل آسمان کی جانب پرواز کرتا نظر آتا ہے تو کہیں انسان کے درد دل کی داستان سنا کر وہ قاری کے دل کی دھڑکن بڑھا دیتے ہیں۔ کسی مقام پر خواجہ صاحب ماہر تاریخ داں کی طرح تاریخ کے اوراق پلٹ کر ماضی کی شان و شوکت اور عظمت و شجاعت کی داستان سناتے نظر آتے ہیں۔ غرض کہ ''سیپارۂ دل'' انشائیہ مضامین کا ایک عجیب گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ اور خوشبو کے پھول ہیں جو نگاہ کو سرور اور دل کو تازگی دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی تجزیاتی قوے معمولی چیزوں سے بھی روحانی اور اخلاقی نکتہ تلاش کر لیتی تھی۔ چنانچہ وہ منحوس تصور کیے جانے والے پرندے اُلّو کی زندگی میں حکیمانہ نکتہ تلاش کر لیتے ہیں۔ تو دیا سلائی کا ایک معمولی تنکا بھی مغرور انسانوں کے غرور کو خاک میں ملانے کے لئے کافی ہے۔ یہ معمولی تنکا جو تلخ و ترش باتیں کرتا ہے وہ پڑھنے اور غور کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے مغل بادشاہوں کے خاندان سے متعلق افراد کے دردناک و عبرت ناک واقعات لکھ کر یہ حکیمانہ نکتہ قوم کے سامنے پیش کیا کہ انسان کو اپنی قوت و اقتدار پر غرور اور بے جا فخر نہیں کرنا چاہیے کہ اس کا انجام ہمیشہ عبرت ناک ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح ''خدائی گراموفون'' اور کھٹکا'' جیسے معمولی عنوانات قائم کر کے انہوں نے تصوف کے باریک نکات کو ذہن نشین کرایا۔ اسی طرح یوم ''الست کی دعا''، ''مزار حضرت یوسف پر دعا''، ''محراب حضرت زکریا میں دعا'' اور ''حالِ دل'' جیسے مضامین عشق الٰہی اور انبیائے کرام کے عشق میں ڈوبے ہوئے مضامین شامل ہیں۔ جن کے مطالعے سے ایمان کی حرارت حاصل ہوتی ہے اور قلب و روح کے تذکیہ کا سامان بہم ہوتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا اسلوب دل کش، بے ساختہ، بے تکلف اور پُر تاثیر ہے۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے سادہ و سلیس زبان کا استعمال کرتے ہیں تاکہ قاری الفاظ کے معنی میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ موقع و محل کی مناسبت سے ان کی تحریر میں ایک قسم کی گداختگی در آتی ہے جو بھرپور اثر رکھتی ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی لکھتے ہیں:

> ''خواجہ صاحب کی تصانیف پڑھنے والے پر ابتدا ہی سے طرزِ تحریر کی دل کشی کا اثر ہونا لگتا ہے۔ شروع سے آخر تک عبارت میں انتہا درجے کا بے ساختہ پن اور بے تکلفانہ انداز ہے جو آمد کا پہلو لیے ان کے اسلوبِ بیان میں ایک خاص ندرت اور تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔''
>
> (مختصر تاریخ ادب اردو ص ۴۴۳ ڈاکٹر سید اعجاز حسین)
>
> ''دوسری ممتاز خوبی ان کے بیان میں سوز گداز کا پہلو ہے وہ جب چاہتے ہیں موقع محل کو دردناک بنا دیتے ہیں۔ اس قدر دردناک کہ دل سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے۔''
>
> (مختصر تاریخ ادب اردو. ص ۴۳۰ ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کی زبان عام فہم اور دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ان کا لہجہ عام فہم ہے۔انہوں نے عبارت میں موقع ومحل کی مناسبت سے ہندی کے ٹھیٹھ الفاظ اور عربی وفارسی کے مشکل الفاظ بھی استعمال کیے ہیں،لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ ان الفاظ کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا، نہ ہی عبارت کی روانی پہ حرف آتا ہے۔ان کی تحریر میں طویل جملوں کی جگہ مختصر جملے استعمال ہوتے ہیں جو اپنے اندر عجیب اثر رکھتے ہیں۔ان کے اسلوب میں سنجیدگی اور متانت کا پہلو خاص طور پر نمایاں ہے جو ان کے خانقاہی مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔

﴿۳﴾خواجہ حسن نظامی کے انشائیے:۔

ذیل میں خواجہ حسن نظامی کے مشہور انشائیے ''مچھر'' سے اقتباسات پیش ہیں:

﴿انشائیہ نمبر ۱﴾''مچھر''

''یہ بھنبھناتا ہوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔رات کی نیند حرام کردی ہے۔ہندو مسلمان،سکھ،عیسائی،یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ہر روز اس کے مقابلے کے لئے ٹیمیں تیار ہوتی ہیں،جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں مگر مچھروں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔شکست پر شکست ہوتی چلی جاتی ہے اور مچھروں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پاسکتا۔طرح طرح کے مصالحے بھی بناتا ہے کہ ان کی بو سے مچھر بھاگ جائیں۔لیکن مچھر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔آتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہوئے آتے ہیں۔بے چارہ آدم زاد حیران رہ جاتا ہے۔اور کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

''مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمت ہے تو مقابلہ کیجیے۔ذات صفات نہ دیکھیے۔میں کالا سہی، بدرونق سہی،نیچ ذات سہی اور کمینہ سہی مگر یہ تو کہئے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیوں کر آپ کی ناک میں دم کرتا ہوں۔یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔یہ تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔حضرت میں تو کان میں آکر ''الٹی میٹم'' دیدیتا ہوں کہ ہوشیار ہوجاؤ۔اب حملہ ہونا ہے۔تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔زمانہ خود فیصلہ کردے گا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا،لمبے لمبے پاؤں والا بے ڈول فتح یاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن والا۔میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردۂ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔کس نے اس کے غرور کو توڑا۔کون اس پر غالب آیا۔کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی؟اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجیے یا مجھ سے سنئے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔''

04.05 مرزا فرحت اللہ بیگ

﴿۱﴾مختصر حالاتِ زندگی: فرحت اللہ بیگ کے آباؤاجداد مغل بادشاہ شاہ عالم کے عہد میں ترکستان سے ہجرت کرکے ہندوستان میں وارد ہوئے۔مرزا فرحت اللہ بیگ کی پیدائش ذی قعدہ ۱۳۰۰ھ مطابق ستمبر ۱۸۸۲ء میں دہلی میں ہوئی۔ان کے بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔چنانچہ ان کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے ان کی پرورش کی۔مرزا فرحت اللہ بیگ نے زمانے کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔انہوں نے ۱۹۰۱ء میں ہندو کالج میں داخلہ لیا۔پھر ۱۹۰۳ء میں سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۵ء میں امتیازی نمبروں سے بی.اے. پاس کیا۔

تلاشِ معاش میں مرزافرحت اللہ بیگ نے ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد کا سفرکیا۔وہاں انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کیااورمختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے حسن کارکردگی سے ترقی کرتے ہوئے سیشن جج کے عہدہ پر مامور ہوئے۔اس منصب پران کا تقررگلبرگہ میں ہوا۔ان کا انتقال حرکتِ قلب بند ہوجانے سے ۲۷/اپریل ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ان کی زندگی کے ابتدائی چوبیس برس دلّی میں اور باقی کے چالیس سال حیدرآباد میں گزرے۔لیکن دلی کی یاد کبھی ان کے دل سے محونہ ہوسکی۔

مرزافرحت اللہ بیگ کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا۔انہوں نے اپنا پہلا مضمون رسالہ ''افادہ'' آگرہ میں لکھا۔مرزافرحت اللہ بیگ نے ہرموضوع پرلکھا۔تنقید،سوانح حیات،اُف یہاں تک کہ انہوں نے اخلاق معاشرت سے متعلق موضوعات پربھی خامہ فرسائی کی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی سنجیدہ تحریریں اتنی مقبول نہ ہوسکیں جتنا کہ مزاحیہ رنگ کے مضامین کوقبول عام کی سند حاصل ہوئی۔

مرزافرحت اللہ بیگ کے مضامین سات جلدوں میں ''مضامین فرحت'' کے نام سے ان کی زندگی میں ہی شائع ہوئے۔اس کے علاوہ ایک شعری مجموعہ ''میری شاعری'' کے عنوان سے شائع ہوا۔مرزافرحت اللہ بیگ اردو کے ممتاز مزاح نگاروں کے درمیان اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔

﴿۲﴾مرزافرحت اللہ بیگ کی انشائیہ نگاری: مرزافرحت اللہ بیگ کے اسلوب کی شوخی اور طنزومزاح کی آمیزش ان کے انشائیوں کودل چسپ بناتی ہے۔ان کے طرزاسلوب کا محاکمہ کرتے ہوئے ڈاکٹرسید محمد عقیل لکھتے ہیں:

> ''فرحت اللہ بیگ کے یہاں نذیراحمد کی طرح قوت بیانی کافی پائی جاتی ہے۔تفصیلات سے مضمون بے حددل چسپ ہوجاتا ہے۔مرزاصاحب کی لطیف اور پرمغزتحریر تفصیل کے موقع پربھی اپنی لطافت کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ان کی لطیفہ پسندطبیعت،ان کی رنگین بیانی،مضمون کے بیچ میں وہ واقعات لاتی ہے جولطف پیدا کرنے کے ساتھ مفہوم کوواضح بنانے میں مدد دیتے ہیں۔کبھی کبھی خفیف سا طنز بھی نظرآتا ہے جوسمجھنے والوں کے لئے کافی معنی خیز ہے۔''

(مختصرتاریخ ادب اردوص.۴۵۵ ڈاکٹرسید اعجاز حسین)

مرزافرحت اللہ بیگ دلّی کے رہنے والے تھےاوردلّی کی زبان ومحاورات پرانہیں عبورحاصل تھا۔ان کے انشائیوں میں مزاح کے پہلو بہ پہلو دلّی کی زبان اورمحاورے تحریر کی شگفتگی میں اضافہ کرتے ہیں۔مرزافرحت اللہ بیگ نے بہت کچھ لکھا۔ان کے مضامین کے سات مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ان میں ایک بڑی تعداد طنزیہ اورمزاحیہ مضامین کی ہے۔یہ مضامین دراصل مرزافرحت اللہ بیگ کے انشائیے ہیں۔وہ بنیادی طور پرایسے انشائیہ نگار تھے جس نے طنزومزاح کی آمیزش سے انشائیہ کودوآتشہ بنادیا۔

مرزافرحت اللہ بیگ مزاجاً شوخ طبیعت کے مالک تھے۔ایسا انسان لطیف ونازک اوراحساس شخصیت کا حامل ہوتا ہے اوراپنے گردوپیش کے ماحول کادوسروں کی بہ نسبت زیادہ گہرا اثرقبول کرتا ہے۔اس کے علاوہ ایسے لوگ اپنے تاثرات بے محابا بیان کردیتے ہیں۔

چنانچہ فرحت اللہ بیگ:

''برملا اپنے دل کی کیفیات بیان کر جاتے ہیں۔لطیف احساس اور خوش طبعی میں گھلے ملے یہ تاثرات کبھی مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے اور کبھی طنز کی چٹکیاں لیتے وجود میں آتے ہیں۔مزاح نگار کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ دلیر ہوتا ہے اور اس لئے بے باک بھی۔وہ گردوپیش کے حقائق پر بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔''

اسلم پرویز (مقدمہ) مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین (انتخاب)

﴿۳﴾ مرزا فرحت اللہ بیگ کے انشائیے:۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے متعدد انشائیے تحریر کیے۔ان میں چند کے عنوانات درج ذیل ہیں:

''ہم اور ہمارا امتحان، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب کی ٹکّر، کل کا گھوڑا، ایڈیٹر صاحب کا کمرہ، دیارِ عشق، کم سنی کی شادی، انجمن اصلاح حالِ بدمعاشاں، مردہ بدست زندہ، پٹنا، بہرا، ایک اور ایک چار'' وغیرہ۔ذیل میں ان کے انشائیوں کے چند اقتباس بطورِ نمونہ پیش کیے جارہے ہیں:

﴿انشائیہ نمبر۱﴾ ''انجمن اصلاحِ حال بدمعاشاں''

''یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ مرغی پر اگر پانی کی ایک بوند بھی پڑ جائے تو وہ سکڑ کر وہیں بیٹھ جاتی ہے اور چاہے مار بھی ڈالو تو آواز نہیں نکالتی اور اسی سے ''بھیگی مرغی'' کا محاورہ نکلا ہے۔فطرت کے مطالعے نے چوروں کو سکھا دیا ہے کہ مرغیوں کو چرانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان کی کسی طرح گیلا کر دیا جائے۔وہ کیا کرتے ہیں کہ جہاں کسی مرغی کو اپنے موقع پر دیکھا اور چپکے سے گیلا کپڑا اس پر ڈال دیا۔ادھر گیلا کپڑا پڑا اور ادھر وہ دبکی۔انہوں نے اُٹھا کر بغل میں دبایا اور چلتے بنے۔اب مرغی ہے کہ آنکھ بند کیے سکڑی سکڑائی بغل میں دبی چلی جارہی ہے۔نہ کُڑکُڑاتی ہے اور نہ منھ، سے آواز نکالتی ہے۔بہرحال یہ طریقہ سیکھ ہم نے سب سے پہلے مولوی صاحب کے مرغے ہی پر ہاتھ صاف کیا۔اس روز بہت دنوں بعد ہمارے ہاں مرغ کا سالن پکا اور سب نے بڑے مزے سے اُڑایا۔مرغ کے بال وال سب گڑھا کھود کر گھر میں دفن کر دیئے۔''

﴿انشائیہ نمبر۲﴾ ''پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکّر''

''علمی مجلس کا رنگ جیسا میں نے یہاں دیکھا نہ پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ دیکھنے کی آرزو ہے۔اس نوابی دربار میں میری صاف گوئی بعض وقت عجیب رنگ لاتی تھی۔ایک روز شام کے وقت دربار گرم تھا کہ دو سائیس صاف ستھری وردیاں پہنے، ریشمی باگ ڈوریں ہاتھوں میں لیے ایک خوب صورت گھوڑے کو ملاحظہ کے لئے لائے۔یہ گھوڑا اسی دن آسٹریلیا سے آیا تھا۔اور نواب صاحب نے کوئی تین ہزار روپئے کو خریدا تھا۔گھورے کو نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے شکر کھلائی، کچھ پڑھ کر اس کی پیشانی پر دَم کیا اور کہا۔''بھئی عجیب چیز ملی ہے۔''بس اتنا سننا تھا کہ مصاحبوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔گھوڑے کا مقابلہ براق اور رفرف تک سے کر ڈالا۔غرض دو گھنٹے تک یہی بے سروپا گفتگو ہوتی رہی۔''

04.06 رشید احمد صدیقی

﴿۱﴾ مختصر حالاتِ زندگی: پروفیسر رشید احمد کا نام رشید احمد صدیقی تھا۔ رشید احمد صدیقی کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ضلع جون پور کا گاؤں مڑھیا ہوں میں وطن تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ آئے۔ لیکن معاشی پریشانی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ چنانچہ تعطیل میں انہیں کچہری میں کلرکی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے انہوں نے فارسی میں ایم.اے. اور ۱۹۲۲ء میں اسی ادارے میں اردو مولوی کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں ریڈر اور ۱۹۵۴ء میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ مئی ۱۹۵۸ء میں یونی ورسٹی سے سبک دوش ہوئے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی ابتدائی زندگی کے حالات و واقعات کو ''آشفتہ بیانی میری'' میں بے حد دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ صوبۂ اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں قائم مذہبی و علمی اداروں کا رشید احمد صدیقی کی شخصیت پر گہرا اثر تھا۔

پروفیر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''رشید صاحب کو اپنے گھریلو ماحول سے یہ سب کچھ ملا۔ پھر قصبائی زندگی سے انہیں دیہاتی زبان، وہاں کی فضا، انسانیت کا ایک گھر دار مگر خاصا پائیدار تصور ملا۔''

(مضمون: رشید احمد صدیقی، مشمولہ رشید احمد صدیقی: شخصیت اور ادبی قدر و قیمت)

رشید احمد صدیقی کی شادی ۱۹۲۳ء میں پولیس انسپیکٹر شمس الحق کی بیٹی جمیلہ خاتون سے ہوئی۔ یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد انہوں نے علی گڑھ میں گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔ ان کا انتقال ۱۹۷۷ء میں علی گڑھ میں ہوا۔

رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ اور اس کی تہذیب سے والہانہ عشق تھا۔ آپ جسمانی طور پر مختلف قسم کے عارضوں کا شکار رہے۔ پہلے گردہ کے عارضہ میں پھر عارضۂ قلب کا شکار ہو گئے۔ اگر ہم رشید احمد صدیقی کے مضامین کا مطالعہ کریں تو ذہن کے پردے پر ایک باغ و بہار شخصیت کی تصویر اُبھرتی ہے۔ لیکن مختلف قسم کے عارضوں نے انہیں بے حد کم زور اور نڈھال کر دیا تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''آپ ایک باغ و بہار آدمی کی تلاش میں ہیں اور آپ کو دو چار ہونا پڑتا ہے ایک خزاں رسیدہ ہستی سے .....رشید صاحب ایک ناکام عاشق کی زندہ تصویر ہیں۔''

(مضمون: رشید احمد صدیقی، مشمولہ رشید احمد صدیقی: شخصیت اور ادبی قدر و قیمت)

رشید احمد صدیقی عملی زندگی کے انسان نہیں تھے۔ سیاست سے انہیں دور کا واسطہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود مصلحت پسند ہرگز نہیں تھے۔ ان کی شخصیت کا خمیر دراصل غیرت اور خودداری سے اُٹھا تھا۔

> ''وہ اپنی ہر ضرورت کو دوستوں کی معمولی سی مصلحت پہ قربان کر سکتے ہیں۔ وہ کسی سے کچھ مانگتے نہیں۔ اسے بہت کچھ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ مشرقیت، شرافت، معقولیت، انسانیت کو انہوں نے جس طرح سے زندگی میں برت کر دکھایا کم نے دکھایا ہوگا۔''

(مضمون: رشید احمد صدیقی، مشمولہ رشید احمد صدیقی: شخصیت اور ادبی قدر و قیمت)

اپنے زمانۂ طالب علمی میں وہ طلبا کی انجمن کے سکریٹری رہے۔اور یونی ورسٹی کے طلبا کی میگزین ''علی گڑھ منتھلی'' کے ایک عرصے تک ایڈیٹر بھی رہے۔

﴿۲﴾رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری: رشید احمد صدیقی کے مضامین کے دو مجموعے ''مضامین رشید'' اور ''خنداں'' ہیں ان کا طرزِ تحریر دل کش وشگفتہ ہے اور وہ اپنے مضامین میں ایسی فضا پیدا کرتے ہیں کہ قاری ایک عجیب فرحت وانبساط سے ہم کنار ہوتا ہے اور اس کی دل چسپی بڑھتی جاتی ہے۔ان کے مضامین میں طنز وظرافت کی گہری آمیزش ہے۔اس لئے انہیں طنز ومزاح کا ایک اہم فن کار بھی سمجھا جاتا ہے۔لیکن رشید احمد صدیقی محض طنز ومزاح سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے مضامین میں مخصوص واقعات کی طرح بلیغ اشارے کرکے اپنے قاری کا امتحان بھی لیتے ہیں۔ڈاکٹر سید محمد عقیل کے مطابق:

> ''رشید صاحب کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے۔ہر قدم پر وہ مخصوص واقعات کی طرح لطیف اشارے کرتے ہیں جن سے وہی لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں جو تاریخ اور سیاست سے واقف ہیں.....ان کے خیالات کے دور رسی، گہرائی اور نزاکت عام مذاق سے علیحدہ ہوتی ہے۔رشید احمد صدیقی کے یہاں ذہانت کا ثبوت ہر جگہ نمایاں ہے۔ان کی مثالیں ان کے مضامین کی جان ہوتی ہیں وہ ''ارہر کا کھیت'' ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ اس کو اسمبلی اور پارلیمنٹ کے دوش بدوش رکھ سکتے ہیں۔''
>
> (مختصر تاریخ ادب اردو ص.۴۳۰.ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

رشید احمد صدیقی علی گڑھ کے شیدائی ہیں۔انہیں علی گڑھ سے والہانہ عشق ہے۔یہی سبب ہے کہ علی گڑھ ان کی تصانیف میں جا بجا جلوہ گر ہے۔چناں چہ جو لوگ علی گڑھ اور اس کی تہذیب سے واقف ہیں وہی ان کی تحریر کا حقیقی لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

نور الحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''علی گڑھ کی اس فراوانی کے باوجود رشید احمد صدیقی کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔''دیہاتی ڈاکٹر، ارہر کا کھیت، وکیل، چارپائی، ہو جو شئے ان کے مشاہدے میں آتی ہے اس پے بے تکان لکھ ڈالتے ہیں۔زبان پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل ہے۔لفظ ان کے ہاتھ میں آکر موم کی طرح نرم ہو جاتے ہیں۔وہ جس شکل میں انہیں ڈھالنا چاہتے ہیں بہ آسانی ڈھال لیتے ہیں۔''
>
> (تاریخ ادب اردو..نور الحسن نقوی...ص۴۳۰)

رشید احمد صدیقی کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین دراصل انشائیے ہیں۔یہ مضامین انشائیے کے معیار پر کھرے اُترتے ہیں۔

پروفیسر منظر عباس نقوی لکھتے ہیں:

> ''اگر چہ رشید صاحب نے اپنی تحریروں کو کہیں انشائیے کا نام نہیں دیا۔لیکن مصنف لے لب ولہجہ،

مضامین کی ساخت، موضوع کا انداز پیش کش اور تحریر کے اسلوبیاتی محاسن کی بنا پران کی بیش تر تحریریں انشائیے اور صرف انشائیے کے زمرے میں آتی ہیں۔"

مضمون: رشید صاحب کا اسلوب (مضامین رشید کے حوالے سے)

مشمولہ: رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت

رشید احمد صدیقی کی نثر ایک ایسے زندہ دل، خوش مذاق اور مہذب انسان کی گفتگو ہے جو ادب کے قوانین کے پاس دار، آدابِ گفتگو سے واقف اور اپنے خیالات کو دل کش پیرائے میں ادا کرنے پر قادر ہیں۔ ان کی تحریر کی ایک اہم خصوصیت قول محال (PARADOX) کی تکنیک کا استعمال ہے۔ اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی نے دیگر تکنیکوں کا بھی سہارا لیا ہے۔ مثلاً بالکل قطعی اور غیر مذبذب انداز میں بات کہنا، جملوں کی متوازیت، تضاد جملوں کا موازنہ کے علاوہ وہ رمز وایما سے بھی مدد لیتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے کمالات کا اعتراف تقریباً تمام نقادوں نے کیا ہے۔ بیسویں صدی کی نصف آخر کی دہائیوں کے انشائیہ نگاروں اور مزاح نگاروں پر رشید صاحب کا گہرا اثر ہے۔

﴿۳﴾ رشید احمد صدیقی کے انشائیے:۔

رشید احمد صدیقی نے متعدد انشائیے تصنیف کیے۔ چند انشائیوں کے عنوانات یہاں درج کیے جاتے ہیں:

"اپنی یاد میں، چارپائی، ارہر کا کھیت، شیطان کی آنت، دھوبی، وکیل صاحب، پاسبانِ گواہ، گھاگ، مغالطہ، مثلث، مرشد اور آمد میں آورد" وغیرہ۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں سے چند اقتباسات یہاں پیش ہیں:

﴿انشائیہ نمبر ۱﴾ "چارپائی"

"فراق اور وصال، بیماری و تندرستی، تصنیف و تالیف، سرقہ اور شاعری سب سے چارپائی ہی پر نپٹتے ہیں۔ بچے، بوڑھے اور مریضوں اس کو بطور پاخانہ، غسل خانہ کام میں لاتے ہیں۔ کبھی ادوائن کشادہ کردی، کبھی بُنا ہوا حصہ کاٹ دیا گیا اور کام بن گیا۔ پختہ فرش پر گھسیٹیے تو معلوم ہوکوئی ملٹری ٹینک مہم پہ جارہا ہے یا بجلی کا تڑاقا ہو رہا ہے۔ کھٹملوں سے نجات پانے کے لئے جو ترکیبوں کی جاتی ہیں اور جس جس آسن میں چارپائی نظر آتی ہے یا جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے ان پر غور کر لیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستانی بیوی کا تخیل ہندوستانیوں نے چارپائی ہی سے لیا ہے۔"

﴿انشائیہ نمبر ۲﴾ "ارہر کا کھیت"

"دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائیڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور دوسرے حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائیڈل پارک کی خوش مغلیاں آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہوجاتی ہیں۔ ارہر کے کھیت کی خوشی مغلیاں اکثر واٹرلو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ سے پہلے یہ مہم سر کر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانیوں کو اسمبلی یا کونسل میں۔ دونوں بولتے ہیں۔ ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے بسورتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں جن سے ان کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

04.07 خلاصہ

انشائیے کا شمار اردو کی جدید نثری اصناف میں ہوتا ہے۔اردو میں انشائیہ انگریزی سے آیا۔انشائیہ نگار کسی موضوع کو بھی اظہارِ خیال کے لئے منتخب کر کے بے تکلف، بے ساختہ انداز میں شگفتگی اور ندرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات کرتا ہے۔وہ اپنے دل کی باتیں مزے لے لے کر کر بیان کرتا ہے۔

سرسید احمد خاں کے مضمون ''امید کی خوشی'' کو اردو کا پہلا انشائیہ قرار دیا گیا ہے۔سرسید احمد خاں کے بعد محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، فرحت اللہ بیگ، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، مہدی افادی، پطرس بخاری، سجاد انصاری، شوکت تھانوی، ناصر علی دہلوی، شفیق الرحمٰن، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، اور کنھیّا لال کپور وغیرہ اردو کے معروف انشائیہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔جنہوں نے اپنی تصانیف سے اردو میں انشائیے کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا۔ عہد حاضر کے انشائیہ نگاروں میں دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، مسیح انجم، شفیقہ فرحت، پرویز اللہ مہدی، حبیب ضیاء، نصرت ظہیر، حلیمہ فردوس، اور عابد معز وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

محمد حسین آزاد کی علمی اور ادبی صلاحیتیں بے پناہ تھیں۔انہوں نے یونانی اور انگریزی ادب کے اثر سے اردو میں اخلاقی اور اصلاحی مگر دل چسپ مضامین کی بنیاد ڈالی جنہیں ناقدین نے بجا طور پر انشائیہ تسلیم کیا ہے۔آزاد نے تمام مضامین کو ''نیرنگ خیال'' میں کر دیا ہے۔ نیرنگ خیال کو اردو میں انشائیے کے پہلے مجموعہ کی حیثیت حاصل ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی پیدائش ۱۸۷۸ء میں ہوئی۔خواجہ حسن نظامی کثیر التصانیف تھے۔انہوں نے جتنی کتابوں کی تصنیف کی شاید اردو کے کسی اہل قلم نے نہیں کی۔''سیپارۂ دل'' اور ''چٹکیاں گدگدیاں'' خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کے دو مجموعے ہیں۔خواجہ صاحب کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا تھا۔انہیں اظہارِ خیال کے لئے موضوع کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہونا پڑتا تھا۔''دیا سلائی، تنکا، برف، لالٹین، کھٹکا، گراموفون، یوم الست کی دعا، حال دل اور مچھر'' وغیرہ ان کے انشائیے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی پیدائش ستمبر ۱۸۸۳ء میں دہلی میں ہوئی۔بچپن ہی میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ان کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے ان کی پرورش کی۔انہوں نے دلّی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے ۱۹۰۵ء میں بی.اے. پاس کیا۔تلاشِ معاش میں ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد کا رخ کیا اور مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے سیشن جج کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ان کا انتقال ۲۷/اپریل ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا۔مرزا فرحت اللہ بیگ نے تنقید، سوانح حیات، افسانہ وغیرہ مختلف اصناف اور موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ان کے مضامین سات جلدوں میں ''مضامینِ فرحت'' کے نام سے ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دلّی والے تھے اور دلّی کی زبان اور محاورات پر انہیں عبور حاصل تھا۔ان کے انشائیوں میں مزاح کے پہلو بہ پہلو دلّی کی زبان اور محاورے تحریر کی شگفتگی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔انہوں نے متعدد انشائیے تحریر کیے۔''ہم اور ہمارا ہندوستان، پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکّر، کل کا گھوڑا، ایڈیٹر صاحب کا کمرہ، کم سنی کی شادی، انجمن اصلاحِ حال بد معاشاں'' وغیرہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے چند انشائیوں کے عنوانات ہیں۔

پرفیسر رشیداحمد صدیقی کا نام رشیداحمد تھا۔اتر پردیش کے ضلع جون پور کے گاؤں مڑھیاؤں ان کا وطن تھا۔ رشیداحمد صدیقی کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔انٹرنس پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ آئے۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے انہوں نے فارسی میں ایم.اے.کیا۔ان کا تقرر شعبۂ اردو میں ہوا اور ترقی کرتے ہوئے مئی ۱۹۵۸ء میں پروفیسر کے عہدہ سے سبک دوش ہوئے۔ان کا انتقال ۱۹۷۷ء میں علی گڑھ میں ہوا۔انہیں علی گڑھ اور اس کی تہذیب سے والہانہ عشق تھا۔''مضامین رشید''اور''خنداں''رشیداحمد صدیقی کے مضامین کے دو مجموعے ہیں۔ان کا طرز تحریر شگفتہ ہے۔ان کے مضامین میں طنز مزاح کی گہری آمیزش ہے۔ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین دراصل انشائیے ہیں۔''اپنی یاد میں، چارپائی، ارہر کا کھیت، شیطان کی آنت، دھوبی، وکیل صاحب، پاسبان، گواہ، گھاگ، مغالطہ، اور مرشد'' وغیرہ ان کے چند انشائیوں کے عنوانات ہیں۔

04.08 فرہنگ

استفادہ	: فائدہ حاصل کرنا	خودنوشت	: خود کا لکھا ہوا
بولہوسی	: حرص	ساخت	: بناوٹ
تنگ دستی	: غربت، افلاس	قلم برداشتہ	: بے ساختہ لکھنا
خراج تحسین	: تعریف	کفالت	: پرورش کرنا

04.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ اردو کے پانچ انشائیہ نگاروں کے نام تحریر کیجیے

سوال نمبر۲ انشائیہ کی خصوصیات اختصار کے ساتھ بیان کیجیے

سوال نمبر۳ محمد حسین آزاد کے اسلوب نگارش پر اختصار کے ساتھ اظہارِ خیال کیجیے

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ خواجہ حسن نظامی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۲ رشیداحمد صدیقی کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات واضح کیجیے؟

سوال نمبر۳ محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : محمد حسین آزاد نے کس ملک کا سفر کیا؟

(الف) کابل (ب) جاپان (ج) چین (د) نیپال

سوال نمبر۲ : محمد حسین آزاد کے والد کو کس الزام میں شہید کی گیا؟

(الف) مخبری (ب) بغاوت (ج) غداری (د) جاسوسی

سوال نمبر۳ : ''نیرنگِ خیال'' کتنے حصوں پر مشتمل ہے؟

(الف) پانچ (ب) تین (ج) چار (د) دو

سوال نمبر۴ : ''نیرنگِ خیال'' کے دوسرے حصے میں کتنے انشائیے ہیں؟

(الف) سات (ب) چار (ج) پانچ (د) آٹھ

سوال نمبر۵ : ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار'' کس کا انشائیہ ہے؟

(الف) حالؔی (ب) محمد حسین آزاد (ج) شبلؔی (د) محسن الملک

سوال نمبر۶ : خواجہ حسن نظامی کے خاندان کا تعلق کس صوفی بزرگ سے تھا؟

(الف) خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ (ب) بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ (ج) خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ

(د) بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ

سوال نمبر۷ : ''انجمنِ اصلاحِ حالِ بدمعاشاں'' کس کا نشائیہ ہے؟

(الف) الطاف حسین حالی (ب) نذیر احمد (ج) کنہیالال کپور (د) مرزا فرحت اللہ بیگ

سوال نمبر۸ : مرزا فرحت اللہ بیگ کی زندگی میں اُن کے مضامین کے کتنے مجموعے شائع ہوئے؟

(الف) سات (ب) دس (ج) پانچ (د) چار

سوال نمبر۹ : رشید احمد صدیقی کے مضامین میں کس شہر کا ذکر جا بجا ملتا ہے؟

(الف) علی گڑھ (ب) لکھنؤ (ج) حیدرآباد (د) اکبر پور

سوال نمبر۱۰ : ''چار پائی'' کس کا انشائیہ ہے؟

(الف) پطرس بخاری (ب) مشتاق احمد یوسفی (ج) کنہیالال کپور (د) رشید احمد صدیقی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (الف) کابل	جواب نمبر۶	: (ج) خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ
جواب نمبر۲	: (ب) بغاوت	جواب نمبر۷	: (د) مرزا فرحت اللہ بیگ
جواب نمبر۳	: (د) دو	جواب نمبر۸	: (الف) سات
جواب نمبر۴	: (ج) پانچ	جواب نمبر۹	: (الف) علی گڑھ
جواب نمبر۵	: (ب) محمد حسین آزاد	جواب نمبر۱۰	: (د) رشید احمد صدیقی

04.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تاریخ ادب اردو از نورالحسن نقوی

۲۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ

۳۔ رشیداحمدصدیقی:شخصیت اورادبی قدروقیمت از مترجم....مرزامحمدعسکری

۴۔ مختصرتاریخ ادب اردو از پروفیسرابوالکلام قاسمی

۵۔ مرزافرحت اللہ بیگ کے مضامین از ڈاکٹرسیداعجازحسین

ترمیم واضافے ڈاکٹرسیدمحمدعقیل

بلاک نمبر 02

اکائی 05	خطوط نگاری کا فن	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی 06	اُردو کے اہم خطوط نگار	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی 07	طنز و مزاح کا فن	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی 08	اُردو کے اہم طنز و مزاح نگار	ڈاکٹر شریف احمد قریشی

اکائی 05 خطوط نگاری کا فن

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد

05.02 : تمہید

05.03 : خطوط نگاری: تعریف،فن اوراصول

05.04 : خطوط نگاری کے اوّلین نمونے

05.05 : خطوط نگاری کا بیرونی ممالک میں آغاز وارتقا

05.06 : اُردوادب خطوط نگاری کی روایت

05.07 : ادب میں خطوط کی اہمیت وافادیت

05.08 : اہم خطوط نگاروں کے موضوعات واسالیب

05.09 : چند خطوط نگاروں کے خطوط کے اقتباسات

05.10 : خلاصہ

05.11 : فرہنگ

05.12 : سوالات

05.13 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

خطوط نگاری باقاعدہ ایک فن ہے۔ادب کی دیگر اصناف جیسے داستان ، ناول،افسانہ،سوانح،خاکہ وغیرہ کی طرح اسے بھی ایک صنف کا درجہ حاصل ہے۔خطوط کی ادبی اور سماجی حیثیت مسلّم ہے۔خط کتنا ہی نجی یا ذاتی کیوں نہ ہواور موضوع کے اعتبار سے بھی کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ان میں ایسی بہت سی ضروری باتیں مل جاتی ہیں جو کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔اعلیٰ درجہ کے خط میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کسی عمدہ فن پارے کو ادبِ عالیہ میں جگہ دینے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔خطوط میں ہر عہد کے افراد کے ذوق کی تشفّی کا سامان بھی موجود ہوتا ہے۔خطوط کی اہمیت صرف اُن کے موضوعات کی وجہ سے نہیں ہوتی ہے بلکہ اسلوب یا اندازِ تحریر کی وجہ سے بھی خطوط منفرد حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔دیگر اصنافِ ادب کی طرح اُردو کے ہر طالبِ علم کے لئے خطوط کی اہمیت وافادیت اور خطوط نگاری کے فن سے واقفیت ضروری ہے۔

مندرجہ بالا اغراض ومقاصد کے پیشِ نظر اس اکائی میں ''خطوط نگاری کا فن'' کے عنوان کے تحت خطوط نگاری کے فن، بیرونی ممالک میں خطوط نگاری کا آغاز وارتقا، اُردو میں خطوط نگاری کی روایت اور خطوط کی اہمیت وافادیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اہم خطوط نگاروں کے موضوعات واسالیب اور چند خطوط نگاروں کے خطوط کے اقتباسات بھی اس لئے درج کیے گئے ہیں تا کہ آپ خطوط نگاروں کی فنّی خوبیوں اور اُن کے خطوط کے موضوعات واسالیب سے بخوبی واقف ہوسکیں۔

05.02 تمہید

خطوط کی اہمیت کئی اعتبار سے مسلّم ہے۔ خطوط کے مطالعہ سے بہت سی ادبی، علمی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ خطوط جس دَور میں لکھے جاتے ہیں اُس دَور کی تہذیب ومعاشرت، رہن سہن، زبان واُسلوب وغیرہ کے بھی عکّاس ہوتے ہیں۔ خطوط سے انسانوں کی شخصیت وسیرت اور نفسیات کا جیسا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ویسا کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔ بعض خطوط نگاروں کے خطوط اُن کی شخصیت وسیرت کی کھُلی ہوئی کتاب کی طرح ہوتے ہیں تو بعض خطوط نگار اپنے مزاج وکردار کو اپنے خطوط کی تحریروں میں اُبھرنے نہیں دیتے۔ اس لئے خطوط کے فن کو کسی خاص کسوٹی یا بندھے ٹکے اصول پر پرکھا نہیں جاسکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فنِ خطوط نگاری کا مطالعہ نہایت گہرائی وگیرائی سے کیا جائے۔

اسی لئے اس اکائی میں خطوط نگاری کے فن اور خطوط سے متعلّق دیگر اہم عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اگر آپ اس اکائی کا عمیق نظر سے مطالعہ کریں گے تو نہ صرف آپ فنِ خطوط نگاری سے واقف ہوں گے بلکہ خطوط نگاری کے تئیں آپ کی دل چسپی میں بھی مزید اضافہ ہوگا۔

05.03 خطوط نگاری: تعریف، فن اور اصول

﴿۱﴾ خط کی تعریف: دانش وَروں، ادیبوں اور نقّادوں نے خط کی تعریف اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کی ہے جن میں سے چند آرا نہایت ہی اہم ہیں۔ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کا خیال ہے کہ:

> ''جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے اُسے دولوگوں تک پہنچانا، گفتگو کو تحریر کا، مکالمہ کو مراسلہ کا جامہ پہنانا ہے۔''

مولوی عبدالحق نے خط کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

> ''خط دِلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔''

مذکورہ بالا تعریفوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ:

> ''عمدہ اور معیاری خط وہ ہے جس میں خطوط نگار اپنے مخاطب سے باتیں کرتا نظر آئے یعنی ہم کلام ہو اور جس میں بے تکلّفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تاثرات کی واضح جھلک بھی ہو۔''

> ''مختلف مقامات پر موجود دو افراد کی تحریری گفتگو'' کو خط کی مختصر سے مختصر اور جامع تعریف کہا جاسکتا ہے۔

﴿۲﴾ **خطوط نگاری کا فن:** خطوط نگاری باقاعدہ ایک فن ہے۔ خط کو ''نصف ملاقات'' کہا گیا ہے۔ خط وکتابت کے ذریعہ جو لطف حاصل ہوتا ہے یا جو تاثرات قائم ہوتے ہیں وہ ایک طرفہ ہوتے ہیں۔ دوسری جانب بالکل سکوت رہتا ہے یعنی دوبدو گفتگو نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ خط کے لئے ''نصف ملاقات'' کی اصطلاح رائج ہوگئی ہے۔ دوبدو ملاقات یا باہم گفتگو کرنے سے کسی حد تک اِس کو فوقیت حاصل ہے۔

بعض فطری اور غیر فطری وجوہات، ہچکاہٹ یا تکلّف کی بِنا پر جو باتیں دوبدو نہیں کہی جاسکتی ہیں اُنہیں خطوط میں تحریر کیا جاسکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بالمشافہ ملاقات کرنے یا باہم گفتگو کرنے سے ''نصف ملاقات'' یعنی خط کو فوقیت حاصل ہے۔ البتّہ یہ ضرور ہے کہ بعض باتوں کا لطف زبانی گفتگو کے بغیر ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی خطوط کو پوری ملاقات کے بجائے ''نصف ملاقات'' کا درجہ دیا گیا ہے۔

دراصل ''نصف ملاقات'' کا مقولہ خطوط کو پرکھنے کا ایک پیمانہ ہے۔ جس کے ذریعہ خط کے موضوع، اسلوب یا اندازِ تحریر کی روشنی میں نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ کسی خط سے ملاقات کا لطف حاصل ہوتا ہے یا نہیں اور اگر ہوتا ہے تو کس حد تک؟

معیاری خط کی سب سے اہم پہچان یہ ہے کہ وہ ملاقات کی تمام اغراض کو پورا کرے اور اُس میں ملاقات کے زیادہ سے زیادہ پہلو نظر آئیں۔ بہ اعتبارِ موضوع عمدہ خطوط کے اُسلوب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اچھّے خطوط کے اسالیب میں ملاقات کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

﴿۳﴾ **خطوط نگاری کے اصول:** مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے تقریباً ۱۸۲۵ء میں خطوط نگاری کے کچھ اصول مقرر کیے تھے۔ اگر ان اصولوں پر آج بھی عمل کیا جائے تو خطوط نہایت دل کش اور معیاری ہوسکتے ہیں جن میں سے چند اہم اور بنیادی اصول درج ذیل ہیں:

﴿۱﴾ خط کے شروع میں مکتوبِ الیہ کو اُس کے موافقِ حال کسی لفظ سے پکارا جائے۔

﴿۲﴾ اس کے بعد زبانِ قلم پر ایک دَم مطلب آجانا چاہیے۔ القاب وآداب، خیریت گوئی اور خیر وعافیت طلبی قطعاً زائد اور بے کار ہے۔

﴿۳﴾ خط لکھنے والے کو اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا ہوجائے۔ مطلب کو اس انداز سے ادا کرے کہ سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

﴿۴﴾ اگر کئی باتیں کہنا ہوں تو اُنہیں نہایت ہوشیاری سے ترتیب دینا چاہیے۔

﴿۵﴾ ایسا نہ ہو کہ الفاظ پیچیدہ ہوجائیں اور مطلب کے اجزاء ایک دوسرے سے مل جائیں۔

﴿۶﴾ مشکل اور دقیق استعاروں اور غیر مانوس الفاظ سے جو زمانہ کے مذاق کے موافق نہ ہوں، ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیے۔

﴿۷﴾ ایک لفظ کو بار بار لکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ زبان کی خوبی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے اور بے فائدہ طوالت سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیے۔

﴿۷﴾ تمام خط میں کسی جگہ مکتوبِ الیہ کے مرتبہ ومنزلت کو اُوجھل نہ ہونے دینا چاہیے۔

مذکورہ اصول وضوابط کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ خط میں کوئی ایسا اسلوبِ بیان نہ ہونا چاہیے جسے گفتگو میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ طویل القاب وآداب اور بغیر خواہش ظاہر کیے ہوئے اپنی خیریت بتانا اندازِ گفتگو کے خلاف ہے۔ اگر مزاج یا خیریت پُرسی لکھنا ضروری ہو تو آخر میں کرنا چاہیے۔ عبارت میں دقیق ومشکل الفاظ، استعارات کا ہونا محض تصنع اور بناوٹ ہے۔ گفتگو اور خط کا اسے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

05.04 خطوط نگاری کے اوّلین نمونے

ابتدا میں خطوط صرف ضرورت کے اظہار کے لئے لکھے جاتے تھے یا اُن میں واقعات وحادثات وغیرہ رقم کر دیے جاتے تھے۔ تحقیق کے ساتھ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خطوط نگاری کی ابتدا انفرادی طور پر ہوئی یا مذہب اور حکومت کے علَم برداروں کے ذریعہ وجود میں آئی۔

اب تک خطوط کے جو اوّلین نمونے دَست یاب ہوئے ہیں اُن میں یا تو وہ خطوط ہیں جو بادشاہ اور اُس کے وزیر اپنے نائبین اور حکومت کے اُن اہل کاروں کو لکھتے تھے جن کی تقرّری دور دراز کے علاقوں میں ہوتی تھی۔ اس طرح کے بیش تَر خطوط میں احکام اور فرمان رقم کیے جاتے تھے۔ دوسری طرح کے وہ خطوط ہیں جنہیں مذہبی پیشواؤں یا رہنماؤں نے مذہب کی اشاعت کے لئے لکھے ہیں۔ اس طرح کے خطوط مذہبی نکات اور روحانی باریک بینیوں سے متعلّق ہیں۔ اُن ارادت کو بھی خطوط کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے جو بعض مذہبی پیشواؤں نے ہندوؤں کو ارسال کیے تھے۔

متذکرہ دونوں طرح کے خطوط کے مجموعے نہ صرف خطوط نگاری کے اوّلین نمونے ہیں بلکہ قدر کی نگاہ سے بھی دیکھے جاتے ہیں۔

خطوط کی اہمیت کے پیشِ نظر ذاتی یا انفرادی خطوط بھی محفوظ کیے جانے لگے۔ دنیا کی بیش تَر ترقّی یافتہ زبانوں کے ادبی اور علمی سرمایہ میں سرکاری، مذہبی اور ذاتی خطوط کے متعدد مجموعے محفوظ ہیں جنہیں خطوط کے اوّلین نمونے قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس اکائی کے دوسرے حصّہ میں بیرونی ممالک میں خطوط نگاری کے آغاز و اِرتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس لئے غیر مُلکی خطوط نگاری سے قطعِ نظر عربی اور فارسی زبانوں کی خطوط نگاری کا مختصر طور پر جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس مختصر جائزہ سے پتہ چلے گا کہ عربی اور فارسی زبانوں کی خطوط نگاری کا اُردو زبان کی خطوط نگاری پر کیا اثر پڑا اور اُردو خطوط نگاری کا فن کس حد تک متاثر ہوا۔

زمانۂ نبوت میں دعوتِ اسلام کے مقصد سے دوسرے ممالک کو متعدد خطوط تحریر کیے گئے تھے جنہیں خطوط نگاری کے اوّلین دستاویزی نمونے قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ضرورت کے مدِّنظر محکمۂ انشا و خطوط نگاری کی بِنا ڈالی۔ خلافتِ اُمّیہ اور خلافتِ عبّاسیہ میں خطوط نگاری نے باقاعدہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان حکومتوں کے عہد میں خطوط کے متعدد مجموعے بھی شائع ہوئے اور خطوط نگاری کے فن سے متعلّق متعدد کتابیں بھی لکھی گئیں۔ خطوط کی اقسام کے مطابق اسالیب وغیرہ مقرر کیے گئے۔ صابی، صائب، عماد اور ابنِ عبدالکریم کا شمار اوّلین خطوط نگاروں میں کیا جاتا ہے جن کے خطوط کے مجموعے عربی ادب کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔

خلافتِ عبّاسیہ کے زوال کے بعد ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد پڑی۔ مغلوں نے عربی کے بجائے فارسی زبان کو دفتری زبان قرار دیا لہٰذا خطوط بھی فارسی زبان میں لکھے جانے لگے۔ فارسی خطوط نگاری ایران سے زیادہ ہندوستان میں پروان چڑھی۔ فارسی زبان میں خطوط کے جو اوّلین مجموعے دَست یاب ہوئے ہیں اُن میں رقعات کے علاوہ صوفیوں، مذہبی پیشواؤں، عالموں اور دیگر افراد کے ذاتی خطوط کی بھی شمولیت ہے۔ فارسی زبان میں لکھے گئے ذاتی اور انفرادی خطوط کے نمونے دَست یاب ہونے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقعوں پر بھی فارسی میں خطوط اور رقعات لکھے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان کے خطوط اور رُقعات کے اس قدر مجموعے دَست یاب ہو چکے ہیں کہ جن کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے۔

اُردوخطوط نگاری کی ابتدافارسی خطوط نگاری کے زیرِ اثر ہوئی۔ایک زمانہ تک فارسی خطوط کی تقلید میں اُردو کے خطوط میں بھی القاب و آداب تحریر کیے جاتے رہے۔رقعاتِ ابوالفضل، رقعاتِ عالم گیر، انشاءِ خلیفہ، انشاءِ مادھورام، انشاءِ فائق، انشاءِ منیراور بہارِعجم کا شمار فارسی زبان کے خطوط کے اہم مجموعوں میں کیا جاتا ہے۔ان میں سے بیش تر مجموعے یا خطوط ایک عرصہ تک مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں درسی کتابوں کی حیثیت سے نصاب میں شامل رہے ہیں۔

05.05 خطوط نگاری کا بیرونی ممالک میں آغاز وارتقا

خطوط نگاری کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ اس فن کی شروعات سلطنتِ روما کے سایہ میں ہوئی ہوگی۔یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے مراکز میں خطوط نگاری کی بنیادیں کسی نہ کسی طرح پڑ گئی ہوں۔یونان میں خطوط نگاری کا شغل نہ عوام میں مقبول ہوااور نہ خواص میں محبوب ہوا کیوں کہ وہاں کی شہری ریاستیں سیاسی اور جغرافیائی حالات کی بنا پر سیّاروں یا خطّوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ہر ریاست کی اپنی ایک محدود دنیااور محدود معاشرت تھی جس میں بسنے والوں کے لئے دوسری ریاستوں اور وہاں کے باشندوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔خطوط نگاری کی نشو ونما کے لئے وسیع معاشرت، باقاعدہ حکومت، عملی زندگی سے واقفیت اور زیادہ سے زیادہ لوگوں سے روابط اوّلین شرائط میں سے ہیں۔اس کے علاوہ خطوط نگاری کے لئے ایک ایسی زبان بھی درکار ہوتی ہے جو دور ونزدیک میں بولی اور سمجھی جائے اور اس میں ادبی حُسن بھی ہو۔رومی معاشرت میں یہ تمام چیزیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔یہی وجہ ہے کہ خطوط نگاری کا آغاز سرزمینِ روم میں ہوا۔

روم کی عملی زندگی کی جھلکیاں اور وہاں کی طرزِ معاشرت کی پرچھائیاں سسرؔو کے خطوط میں جابجا نظر آتی ہیں۔سسرؔو اور روم کے دیگر خطوط نگاروں کے خطوط خطابات، اخلاقیات اور روزمرّہ کی بول چال کے بہترین نمونے ہیں۔ان خطوط کی اقسام بھی جداگانہ ہیں جیسے تہنیتی خطوط، تنبیہی خطوط، تعزیتی خطوط، ناصحانہ خطوط، ملامتی خطوط، رقعات، فرامین وغیرہ۔خطوط نگاری کے فن کو اس حد تک وسعت دی گئی تھی کہ مضامین، موضوعات اور معیار کے اعتبار سے ابتدائیہ، اختتامیہ اور تحریر کے اسالیب بھی وضع کیے گئے تھے۔

انگریزی زبان میں پندرہویں صدی عیسوی میں خطوط نگاری کا آغاز ہوا۔اس سے قبل کے خطوط اب تک دَست یاب نہیں ہوئے ہیں۔قیاس کیا جاتا ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی سے قبل بھی خطوط ضرور لکھے گئے ہوں گے جو گردشِ دَوراں کے سبب ضائع ہو گئے ہوں گے۔نشاۃ الثانیہ کے ابتدا میں جو خطوط تحریر کیے گئے ہیں، وہ بہت اہم نہیں ہیں۔اس دَور کے نجی یا ذاتی خطوط میں بھی نجی یا ذاتی باتوں کا فقدان ہے۔ان خطوط میں ابدی حقائق کے چہرے سے اس بے دردی کے ساتھ نقاب اُٹھایا گیا ہے کہ خطوں کی بنیادی خصوصیات ختم سی ہوگئی ہیں۔

سترہویں صدی عیسوی میں اطالوی خطوط کے تراجم کیے گئے۔جیمز ہاول اس دَور کا اہم قلم کار ہے جسے انگلستان میں خطوط نگاری کا باوا تسلیم کیا جاتا ہے۔اُن کی خطوط نگاری، عبارت آرائی اور ادبی نفاستوں کا بہترین نمونہ ہیں۔جان ہیرنگ ٹین ملکۂ انگلستان کے درباریوں میں سے ایک تھا۔وہ تنہائی پسند تھا۔اپنے باغیچہ میں پھولوں کے پودوں کی دیکھ بھال کرنا، گنگنانا اور خطوط لکھنا اُس کے محبوب مشاغل تھے۔یہ دوبار دیوانہ بھی ہو چکا تھا۔اُس کے خطوط کے موضوعات گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں اور معمولی واقعات سے پُر ہیں۔جن میں بلاغت برائے نام اور زندگی کی حرارت نسبتاً زیادہ ہے۔اٹھارہویں صدی عیسوی کے خطوط نگاروں میں ولیم کوپؔر اور انگریزی کے مشہور شاعر گرےؔ کے نام نہایت

اہم ہیں۔اپنے خاص مذاق کے باعث گرےؔ کو عام لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔اُس کے کچھ مخصوص دوست تھے جن کے نام اُس نے خطوط لکھے ہیں۔ یہ خطوط گرےؔ کی طبعی نفاست، ادبی ذوق اور گہری انسانیت کے آئینہ دار ہیں۔اسی دَور کی ایک اہم خطوط نگار خاتون میری ارٹلے مانٹیگ نے بھی خطوط نگاری کی روایت میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ اُس نے اپنی بیٹی کے نام دل چسپ اور مفید خطوط لکھے ہیں۔ اُس کے بیش تر خطوط بچّوں کی تربیت اور بچّوں کی نفسیات سے متعلّق ہیں جنھیں پڑھ کر تازگی اور ہمہ گیری کا احساس ہوتا ہے۔

رومانی دَور میں بھی بہت سے خطوط نگاروں نے خطوط نگاری کی روایت میں اضافہ کیا ہے۔ چارلس لیمب اپنے مضامین ہی کے لئے مشہور نہیں ہیں۔ اُن کے خطوط بھی ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔ اُن کے خطوط میں پہیلیوں کے اُس رنگ اور رومانیت کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے جو دُنیا کو پُر اسرار بنا دیتی ہیں۔ تنہائی کے مزے، محبت کی حکایتیں اور زندگی کے خوش گوار لطائف اُن کے بیش تر خطوط کے موضوعات ہیں۔ اُن کے اسلوب میں ایک خاص قسم کا دھیما پن اور جذبات کی گرم رَوی پائی جاتی ہے۔ اسی عہد میں بہت سے سیاست دانوں، ادیبوں، نقّادوں اور مذہبی پیشواؤں کے متعدد خطوط دَست یاب ہوئے ہیں مگر ان خطوط میں ندرت، نیرنگی، عبارت آرائی اور فنِ خطوط نگاری کا پوری طرح فقدان ہے۔ کیٹسؔ، شیلیؔ اور بائرنؔ نے بھی خطوط نگاری کے فن میں اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ کیٹسؔ نے اپنی محبوبہ کے نام جو خطوط رقم کیے ہیں اُن میں ایک خاص قسم کی لطافت اور شیریں احساس کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ خطوط نگاری کے اس آغاز و اِرتقا کے جائزے سے واضح ہے کہ روم میں خطوط نگاری کا باقاعدہ آغاز سسروؔ کے دَور میں ہوا۔ انگلستان میں خطوط نگاری کی ابتدا اطالوی زبان کے خطوط کے تراجم سے ہوئی اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے خطوط نگاری کا فن پروان چڑھا۔

05.06 اُردو ادب خطوط نگاری کی روایت

اُردو خطوط نگاری کا اوّلین دَور فارسی زبان کی خطوط نگاری کے انداز سے متاثر نظر آتا ہے کیوں کہ اُردو کے اُدبا و شعرا نے فارسی خطوط نگاری سے متاثر ہو کر اُردو میں اس صنف کا آغاز کیا۔ خطوط نگاری کی روایت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو میں خطوط نگاری کی ابتدا اُنّیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوئی۔ فارسی کے بیش تر خطوط سرکاری نوعیت کے تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے آداب و القاب تحریر کرتا تھا۔ القاب و آداب کی طوالت، تشبیہات و استعارات کی بھرمار، دقیق الفاظ کا استعمال اور مشکل پسندی فارسی خطوط کی خصوصیات تھیں۔ تقریباً یہی تمام خصوصیات فارسی سے منتقل ہو کر اُردو خطوط کا جزو بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے ابتدائی خطوط میں صنائع بدائع، طویل آداب و القاب اور دقیق الفاظ کا استعمال جابجا نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سرنامے، اختتامے، رنگِ انشاء اور تکلّفات بھی فارسی خطوط نگاری سے منتقل ہو کر اُردو خطوط نگاری میں در آئے تھے اور یہی عناصر اُردو خطوط نگاری کی فنّی خصوصیات قرار دیے گئے۔

اُردو کا پہلا خط اور پہلا خط نگار کسے تسلیم کیا جائے ابھی اس مسئلے پر محققین کی آراء میں اختلافات ہیں۔ بعض محققین فسانۂ عجائب کے مصنف رجب علی بیگ سرور کو اُردو کا پہلا خطوط نگار تسلیم کرتے ہیں۔ حامد حسن قادری نے بےخبرؔ کو اُردو کا پہلا خطوط نویس تسلیم کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ بےخبرؔ ۱۸۴۶ء میں خطوط نویسی کی طرف متوجّہ ہوئے تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے نزدیک جان طپش اور راسخؔ عظیم آبادی اُردو کے اوّلین خطوط نگار ہیں جنھوں نے ۱۸۱۴ء سے قبل خطوط لکھے تھے۔ پروفیسر ثریّا حُسین نے ۱۰؍جنوری ۱۸۱۰ء کو لکھے گئے خط کی بنیاد پر افتخار الدّین علی خاں شہرتؔ کو اُردو کا پہلا خط نگار تسلیم کیا ہے۔ یہ خط اُنھوں نے نواب واثق علی خاں کو کوٹلہ سے لکھا تھا۔ اس خط کو اُردو کے ابتدائی خطوط میں

نہ صرف اوّلیت کا درجہ حاصل ہے بلکہ اسے اُردو کا پہلا خط اور افتخار الدّین علی خاں شہرتؔ کو اُردو کا پہلا خط نگار تسلیم کیا جانا چاہیے۔اس کے بعد ۱۸۳۱ء میں راجہ رام موہن رائے نے ایک خط لندن میں لکھ کر پیرس کے لئے ارسال کیا تھا۔

اُردو میں خطوط نگاری کا باقاعدہ آغاز رجب علی بیگ سرورؔ کے خطوط سے ہوتا ہے۔اُن کے خطوط کو جو اہمیت حاصل ہوئی وہ اُن سے پہلے کسی دوسرے خطوط نگار کے حصّہ میں نہ آسکی۔سرورؔ کے خطوط کا پہلا مجموعہ 'انشائے سرور' ۱۸۸۶ء میں نول کشور پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔وہ فنِ خطوط نگاری سے بخوبی واقف تھے۔اُنہوں نے مختلف موضوعات کے خطوط مختلف اسالیب میں تحریر کیے ہیں۔اُن کے بیش تر خطوط طرزِ ادا، شوخی، جاذبیت اور پُر تکلّف عبارت کا بہترین نمونہ ہیں۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو میں خطوط نگاری کی ابتدا مرزا غالبؔ کے خطوط سے ہوئی ہے۔یہ نظریہ اس لئے درست قرار نہیں دیا جاسکتا کہ غالبؔ کے خطوط سے پیشتر کئی لوگوں کے لکھے ہوئے خطوط دَست یاب ہو چکے ہیں۔رجب علی بیگ سرورؔ کے خطوط کا مجموعہ بھی غالبؔ کے خطوط کے مجموعہ سے بہت پہلے شائع ہو چکا تھا۔البتّہ یہ بات سچ ہے کہ مرزا غالبؔ کے خطوط اپنے پیش رَو ادیبوں اور دانش وَروں کے خطوط سے بالکل منفرد انداز کے حامل ہیں۔مرزا غالبؔ نے فارسی خطوط نگاری کے انداز سے انحراف کرتے ہوئے خطوط نگاری میں سہل ممتنع کی کیفیت پیدا کر دی۔اُنہوں نے طویل آداب والقاب، تکلّف اور مرصّع عبارت آرائی کے بجائے عام فہم اور سادہ و سلیس اسلوب اختیار کیا۔اُن کے خطوط کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوبِ الیہ اُن کے سامنے ہے اور وہ اُس سے نہایت بے تکلّفی سے باتیں کر رہے ہیں۔''عودِ ہندی اور اُردوئے معلّٰی'' کے علاوہ اُن کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

مرزا غالبؔ کی خطوط نگاری کی روایت کو جلا بخشنے والوں میں خواجہ غلام غوث، سرسیّد احمد خاں، خواجہ الطاف حُسین حالیؔ، علاّمہ شبلیؔ نعمانی، مولانا محمد حُسین آزادؔ، امیرؔ مینائی، اکبرؔ الٰہ آبادی، مہدی افادی، پریم چند، سعادت حسن منٹوؔ، پطرسؔ بخاری، چودھری محمد علی، علاّمہ اقبالؔ، مولوی عبدالحق، سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزادؔ، جوشؔ ملیح آبادی، نیازؔ فتح پوری، مولانا محمد علی جوہرؔ، سجّاد ظہیر اور پروفیسر گیان چند جین کے نام نہایت اہم ہیں۔

خواجہ غلام غوث کے خطوط انشا پردازی اور دل چسپ عبارت آرائی کا بہترین نمونہ ہیں۔اُنہوں نے مرزا غالبؔ کے خطوط کا مجموعہ ''عودِ ہندی'' کے نام سے مرتّب کیا تھا۔سرسیّد احمد خاں کے بیش تر خطوط سلیس اور عام فہم زبان میں ہیں۔سرسیّد کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتبِ سر سیّد'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔خواجہ الطاف حُسین حالیؔ کے خطوط کی زبان نہایت سلیس، عام فہم اور شوخی و ظرافت سے بھرپور ہے۔اُن کے بیش تر خطوط نہایت کارآمد اور بصیرت افزا ہیں۔اُن کے خطوط کے مجموعہ کا نام ''مکاتبِ حالیؔ'' ہے۔

علاّمہ شبلی نعمانی کے خطوط کے مجموعے ''مکاتیبِ شبلی اور خطوطِ شبلی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔وہ اپنے خطوط میں عالمِ دین اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔شاید وہ اپنی عوامی زندگی کی مجبوریوں اور مصلحتوں کی وجہ سے کُھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکے ہیں البتّہ زہرا بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کے نام لکھے گئے خطوط اُن کے رومانی مزاج اور خلوص و محبت کے عکّاس ضرور ہیں۔علاّمہ اقبالؔ کے بیش تر خطوط علمی، تاریخی، معاشی اور فلسفیانہ مسائل پر مبنی ہیں۔اُنہوں نے اپنے خطوط کے ذریعہ قرآن، حدیث، فقہ، تصوّف، سیرتِ رسول ﷺ اور مذہب کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

مہدی افادی نے جو خطوط اپنے احباب اور دوستوں کو لکھے تھے اُن خطوط کا مجموعہ ۱۹۳۸ء میں اُن کی اہلیہ نے ''مکاتیبِ مہدی'' کے نام سے شائع کرا دیا تھا۔ ان خطوط میں مہدی افادی کہیں ادیب، کہیں نقاد، کہیں ناصح اور کہیں مشفق کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اُن کی انشا پردازی کا کمال یہ ہے کہ وہ اَن کہی بات کو بڑے مزے اور لطف سے کہہ جاتے ہیں۔ اُن کا لہجہ کہیں کہیں اس قدر شوخ اور بے باک ہے کہ عریانی اور فحاشی سے بہت قریب نظر آنے لگتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام ''مکاتیبِ ابوالکلام آزاد، نقشِ آزاد، تبرّکاتِ آزاد، کاروانِ خیال اور غبارِ خاطر'' نہایت اہم ہیں۔ غبارِ خاطر مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۵ء کے دوران اسیری کے زمانے میں اپنے دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط کے موضوعات مختلف ہیں اور حسبِ ضرورت مختلف اسالیب میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اُن کے خطوط کی زبان کہیں عام فہم اور آسان ہے، کہیں فارسی آمیز علمی زبان ہے، کہیں شعریت کا غلبہ ہے اور کہیں طنز وظرافت کی جلوہ گری ہے۔

مولوی عبدالحق نے ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی کے نام جو خطوط تحریر کیے تھے وہ ''مکتوبِ عبدالحق'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے خطوط کی زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ اُن کے یہاں محاوروں کا استعمال جا بجا نظر آتا ہے۔ بیش تر خطوط کے موضوعات علمی اور تحقیقی مسائل سے متعلّق ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام متعدد خطوط لکھے تھے جنہیں احمد ندیم قاسمی نے مرتّب کر کے ''منٹو کے خطوط ندیم کے نام'' کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔ خطوط کا یہ مجموعہ سوانحی اور ادبی حیثیت کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔

پطرس بخاری نے عبدالمجید سالک کے نام خطوط لکھے تھے جو ''پطرس کے خطوط'' کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپ چکا ہے۔ چوں کہ پطرس بخاری ریڈیو کی ملازمت سے وابستہ تھے اس لئے اُن کے خطوط میں ریڈیو، تھیٹر اور فلم سازی سے متعلّق بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اُنہوں نے اُردو اصطلاحات کی جگہ اکثر ہندی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ تاریخی وادبی اعتبار سے اُن کے خطوط کی اہمیت مسلّم ہے۔ دورِ حاضر میں بھی متعدد اُدَبا، شعرا اور دانش وَر اپنے اپنے انداز اور مزاج کے اعتبار سے فنِ خطوط نگاری کی روایت میں قابلِ قدر اضافہ کر رہے ہیں۔

05.07 ادب میں خطوط کی اہمیت وافادیت

خطوط لکھنا ضرورت بھی ہے اور شوق بھی۔ ادیب ہوں یا شاعر، عالم ہوں یا فاضل، کم علم ہوں یا بے علم ہر معیار کا شخص خط لکھتا ہے یا لکھواتا ہے۔ خطوط دل بہلانے کے لئے، وقت گزاری کے لئے، تنہائی کا احساس دور کرنے کے لئے اور کسی عزیز یا دوست سے ہم کلام ہونے کے لئے بھی لکھے جاتے ہیں۔ سرکاری کام کاج سے متعلّق اور کاروباری ضرورت کے تحت بھی خطوط تحریر کیے جاتے ہیں۔ خطوط تہنیتی اور تعزیتی بھی ہوتے ہیں۔ تنبیہی اور مبارک باد کے بھی ہوتے ہیں اس کے علاوہ روزمرّہ کی ضرورت کے تحت بھی لکھے جاتے ہیں۔ خطوط نجی یا ذاتی بھی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ خطوط کی اہمیت وافادیت کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ خطوط کی اہمیت وافادیت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں جن میں سے ادبی اہمیت، تاریخی اہمیت اور سوانحی اہمیت نہایت اہم ہیں۔

بے مقصد مضامین سے پُر خطوط غیر اہم ہوتے ہیں اور ہر خط کی حیثیت بھی ادبی یا معاشرتی نہیں ہو سکتی۔ خطوط ایسے ہونا چاہیے جن میں خطوط نگار اور مکتوب الیہ کے ذہنی میلانات کے ساتھ ساتھ متعلّقہ عہد کی زبان، خطوط نگار کے اسلوب اور اُس عہد کے سیاسی ومعاشرتی

رجحانات وحالات کی جھلک بھی نمایاں طور پر دیکھی جا سکے۔ادبی خطوط کے زمرے میں اُنہیں خطوط کو شامل کیا جانا چاہیے جن میں حفظِ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے متعلّقہ عہد کے عصری مسائل وحالات سے وابستگی اور کارفرمائی کے عناصر موجود ہوں۔تاریخی ومعاشرتی حقائق اورادبی صورتِ حال کے پیشِ نظر لکھے گئے خطوط اس لئے اہم ہوتے ہیں کہ وہ اُس عہد کی تاریخی، سیاسی، معاشرتی، ادبی صورتِ حال وغیرہ کا بہترین ماخذ ہوتے ہیں۔

خطوط کی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔خطوط کی اہمیت وافادیت صرف موضوع اور مواد کی وجہ سے نہیں ہوتی۔خطوط کی اہمیت کو فزوں تر کرنے میں اُس کا اسلوب بھی کارگر اور مددگار ثابت ہوتا ہے۔اعلیٰ درجہ کے خطوط میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک عمدہ فن پارے میں ہوتی ہیں۔نجی، ذاتی اور موضوع کے اعتبار سے محدود بعض خطوط میں بھی فن کی ایسی خوبیاں نظر آتی ہیں کہ مکتوب الیہ اور قاری کو دل چسپیوں کا بہت سا سامان دَست یاب ہو جاتا ہے۔بعض خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جو خطوط نگار کی داستان ہوتے ہوئے بھی قارئین کی داستان بن جاتے ہیں۔خطوط کے ذریعہ ایسی ادبی اور علمی معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں جو کسی دیگر ذرائع سے معلوم نہیں ہوسکتی ہیں۔خطوط کے مطالعہ سے اُس عہد کی تہذیب، معاشرت، سماجی حالات، رہن سہن، زبان، اسلوب وغیرہ کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ خلوص وریاض کی بدولت کوئی شخص کسی کو اپنی طرف متوجّہ کرسکتا ہے مگر ایک زمانہ تک اُسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا یا ہمیشہ کے لئے اُسے اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتا۔اس کے لئے اُس کی شخصیت میں کشش کا ہونا ضروری ہے۔ادب کی مختلف اصناف میں مصنف کی شخصیت کا اظہار مختلف طریقوں یا مختلف زاویوں سے ہوتا ہے۔ناول، افسانہ، ڈرامہ، خودنوشت اور سوانح وغیرہ میں تخلیق کار کی شخصیت کا اظہار اور طرح سے ہوتا ہے جب کہ شاعری میں دوسری طرح سے ہوتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ بیش تر شخصیت ایک رنگ اور ایک مزاج کی حامل نہیں ہوتیں۔ان میں اِرتقا بھی ہوتا ہے اور اُنہیں کتنے ہی نشیب وفراز سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ محققین، ناقدین اور دانش وَر ایسے افراد اور فن کاروں کے چہروں سے پوری طرح نقاب ہٹانے میں قاصر نظر آتے ہیں۔اس لئے کسی تخلیق کار، ادیب یا خطوط نگار کی افتادِ طبع، مزاج اور شخصیت کو بخوبی سمجھنے کے لئے اُس کے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

خطوط کے ذریعہ خطوط نگار اور متعلّقہ افراد کے مزاج، کردار، سیرت، عادات واطوار وغیرہ کا جیسا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ کسی دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہوسکتا۔اس لئے خطوط نگاری کی اہمیت وافادیت کسی شعری ونثری صنف سے کسی قدر کم نہیں بلکہ افزوں تر ہے۔خطوط کی اہمیت وافادیت اس لئے بھی ہے کہ اُن میں ایسا ادبی اور کارآمد مواد بھی ہوتا ہے جس کی روشنی میں کسی ادیب، فن کار یا دانش وَر کے صحیح مقام ومرتبہ کا تعیّن کیا جاسکتا ہے۔

05.08 اہم خطوط نگاروں کے موضوعات واسالیب

جس طرح ہر شخص کی طبیعت وفطرت منفرد اور جداگانہ ہوتی ہے اُسی طرح ہر ادیب، شاعر اور فن کار کا ذوق ومزاج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مختلف خطوط نگاروں کے خطوط کے موضوعات واسالیب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ایک عرصہ تک اُردو کے بیش تر خطوط فارسی خطوط نگاری کی تقلید میں بندھے ٹکے اصولوں کے زیرِ اثر لکھے جاتے رہے ہیں۔

فسانۂ عجائب کے خالق رجب علی بیگ سرؔور کے خطوط اپنے پیش رَو خطوط نگاروں کی خطوط نگاری سے مختلف نظر آتے ہیں۔ وہ خطوط نگاری کے فن اور اصولوں سے بخوبی واقف تھے۔ خطوط نگاری اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ موضوع کی مناسبت سے اسلوب اختیار کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اُن کے خطوط لکھنؤ کی تہذیب، تمدّن اور انسانی جذبات کا بہترین نمونہ ہیں۔ طرزِ ادا کی شوخی، قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی اُن کا اُسلوبِ خاص ہے۔ وہ ایک خط میں لکھنؤ کی بدحالی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''بھائی جس دن سے یہاں منڈیا وُلُٹا ہے، سارے شہر سے پانی چھٹا ہے۔ فلک نے لکھنؤ کی خاک اُڑائی ہے، کیا لکھوں جو ایذا دکھائی ہے۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ہے۔ ہر دم جان کا دغدغہ زبست ہے اور جتنے مل جائیں گے، یہ کہانی زبانی سنائیں گے۔''

غالبؔ نے خطوط نگاری کے ذریعہ اُردو نثر کو ایک نئے اسلوب و انداز سے آشنا کرایا۔ اُنہیں کی خطوط نگاری کی بدولت اُردو خطوط نگاری کو باقاعدہ ایک صنف بھی تسلیم کیا گیا۔ اُن کے خطوط کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مکتوبِ الیہ اُن کے سامنے ہے اور وہ اُن سے بے تکلّف دوست اور آشنا کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔ اُن کے یہاں تکلّف وتصنع کے بجائے سادگی، سلاست اور صفائی پائی جاتی ہے۔ اُن کے بعض خطوط ڈرامائی انداز کے ہیں تو بعض خطوط علمی زبان کے بہترین نمونے ہیں۔ وہ موضوع کی مناسبت سے کبھی استدلالی، کبھی تخلیقی اور کبھی بیانیہ انداز و اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ اُن کے خطوط کو اُن کی مکمّل سوانح عمری بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اُن کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں جس کا ذکر اُنھوں نے اپنے خطوط میں نہ کیا ہو۔ اُن کے خطوط متنوّع موضوعات، مختلف اسالیب اور جدید اُردو نثر کا سرچشمہ ہیں۔

خطوط نگاری اُن کا محبوب مشغلہ تھا جس کے متعلّق اُنھوں نے ایک خط میں اس طرح اظہار بھی کیا ہے: سنوعطرِ مجموعہ کہتے ہیں

''مَیں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا مَیں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا ہے جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو، میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔''

غلام غوث بے خبؔر کے بعض خطوط قدیم طرزِ نگارش اور بعض خطوط غالبؔ کی نثر نگاری کی تقلید کا نمونہ ہیں۔ وہ جب اپنے خطوط میں کسی کی مدح سرائی کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے نثر میں قصیدہ گوئی کی گئی ہے۔ اُنھوں نے مرزا غالبؔ کے خطوط کے ایک مجموعہ کو ''عودِ ہندی'' کے نام سے مرتّب کیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی خطوط نگاری کا اثر اُن کی طرزِ نگارش پر پڑا۔

جیسا کہ اُن کے ایک خط کے درج ذیل اقتباس سے بھی ظاہر ہے:

''کیوں مخدوم آپ کو کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ایک فقیر گوشہ نشیں درویش عزلت گزیں بے خبر دل فریں، نام میرا دعا گوئے قدیم، الہٰ آباد میں رہتا ہوں، کچھ اس کی خبر تو لیں کہ وہ ہے یا کیا ہوا۔''

سرسیّد احمد خاں محض مقصد و مدعا کے لئے خطوط لکھتے تھے۔ اُن کے بہت سے خطوط دفتری نوعیت کے ہیں اور بعض خطوط ذاتی حالات اور موجودہ حالات کے عکّاس ہیں جن میں ادبی مسائل کی طرف کم توجّہ دی گئی ہے۔ اُن کے خطوط اُن کی دیگر نثری تحریروں ہی کی طرح شگفتہ

ہیں جن میں ظرافت اور شوخی کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے خطوط کی تحریروں میں اُن کی شخصیت ایک مصلحِ قوم، ایک معلّمِ اخلاق اور ایک رہنما کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔ اُن کے بیش تر خطوط سلیس اور عام فہم زبان کے بہترین نمونے ہیں جیسا کہ ڈپٹی سیّد امداد علی کو تحریر کیے گئے ایک خط کے درج ذیل اقتباس سے بھی ظاہر ہے:

''مَیں یہاں خوش ہوں۔ کام بہت کم ہے۔ تصنیفِ کتب کو بہت فرصت ہے۔ چھاپہ خانہ فضلِ الٰہی سے جاری ہے۔ تفسیر چھپ رہی ہے۔ مجھ کو بڑا اشتیاق اس بات کے دریافت کرنے کا ہے کہ آپ کے اور ہمارے شفیق صدرالصدور ولی اللہ سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔ مَیں سُنتا ہوں کہ ممدوح بڑی دھوم دھام سے کچہری فرماتے ہیں اور اگلوں کی نیک نامی مٹانا چاہتے ہیں۔''

خواجہ الطاف حُسین حالؔی کے خطوط اُن کی سیرت، شخصیت، ذاتی زندگی اور ادبی کارناموں کا آئینہ دار ہیں۔ اُن کے یہاں سنجیدگی کے ساتھ کہیں کہیں شوخی وظرافت بھی ہے۔ اُن کے بیش تر خطوط نجی اور ذاتی ہیں۔ سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے گئے خطوط سے اُن کی اور اُن کے عزیز واقارب کی زندگی کے بہت سے گوشے وا ہوئے ہیں۔ اُن کے یہاں متانت، سنجیدگی، دھیما پن اور روشن مزاجی جا بجا نظر آتی ہے۔ اُن کے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انانیت وخودنمائی کے بجائے بے نفسی اور منکسر المزاجی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اُدَبا، شعرا اور نَو مشق قلم کاروں کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ظفر علی خاں کی ایک نظم پڑھ کر حالؔی نے اُنہیں ایک خط لکھا جس کی چند سطور درج ذیل ہیں:

''وہ جس چیز کو شاعری کی جان کہنا چاہیے اور جس کو جادو کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، کہیں نظر نہیں آتی لیکن اس نظم کو دیکھ کر مَیں متحیّر ہو گیا..... اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت دے اور آپ اپنی خداداد لیاقت کے جوہر اسی طرح مدّت دراز تک ظاہر کرتے رہو۔''

مہدی افادی کے خطوط بالغ نظری اور پُر لطف اندازِ بیان کے حامل ہیں۔ اُن کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اُنہوں نے اپنے دوست واحباب اور اخبارات ورسائل کے مدیران کے نام بہت سے خطوط لکھے ہیں جو نہ صرف اُن کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں بلکہ اُن کی پوری زندگی کی تصویریں بھی ہیں۔ اُن کے خطوط کا اندازِ بیان برجستہ، بے ساختہ اور بے تکلّفانہ نہیں ہے بلکہ اُن کی کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے بیش تر خطوط ادبی مباحثوں، اخبارات ورسائل کے تبصروں اور ادیبوں وشاعروں کی نگارشات کی تنقیدوں پر مبنی ہیں۔ وہ باتوں ہی باتوں میں باریک نکتے اور بڑے پتے کی باتیں رقم کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے خطوط کی تحریروں میں کہیں تحصیل دار کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں، کہیں شوہر، باپ اور دوست کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں اور کہیں ادیب کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اُن کے اُسلوبِ خاص اور فنّی خوبیوں کی جھلک کے لئے اُن کے ایک خط کا اقتباس درج ہے جو اُنہوں نے اپنے ایک دوست کو تحریر کیا تھا۔

''تم شوق سے آؤ، جم جم آؤ، ڈنکے کی چوٹ یعنی توند پر ہاتھ پھیرتے آؤ اور اپنی ویلر جوڑی یعنی شیخ کو بھی لاؤ، سمجھو یا نہ سمجھو میری وطنیت یعنی دنیائے احباب تم ہی دونوں تک محدود ہے۔ اونچی سے اونچی سوسائٹی میں بیٹھا، بڑے بڑے جگمگاتے نظارے دیکھے، عمر اسی میں گزری لیکن قسم لے لو اگر آنکھیں خیرہ ہوئی ہوں۔ بجلی کی ہوش رُبا روشنی میں بیٹھ کر بھی کبھی اپنے سادہ چراغوں سے بے نیاز نہ ہوا۔''

علاّمہ اقبالؔ نے بہت سے خطوط لکھے ہیں جن سے اُن کے علمی وادبی مذاق اور فنّی خوبیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر چہ وہ زندہ دل انسان تھے مگر اُن کے خطوط میں شوخی وظرافت مفقود سی ہے۔ اُن کے خطوط کے مطالعہ سے اُن کی زندگی کے واقعات کا زیادہ علم نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطوط میں وہ اپنی شخصیت اور زندگی کو نمایاں کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے مختلف علمی، تاریخی، معاشی اور فلسفیانہ مسائل پر کھُل کر بحث کی ہے اور قرآن وحدیث، شریعت وتصوّف، فقہ وفقر کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُن کے متعدد خطوط اُن کے نظریات وتصوّرات سے متعلّق ہیں جن کے ذریعہ خودی، تصورِ شاہین اور تصوّف وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ اُنہوں نے اپنے بعض خطوط میں اپنے اشعار وافکار کی تشریح بھی کی ہے۔ وہ اپنی شاعری کے متعلّق سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''فنِ شاعری سے کبھی مجھے دل چسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس مُلک کی حالت وروایت کی روح سے مَیں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزادؔ کے خطوط کے موضوعات میں تنوّع ہے۔ وہ موضوع کی مناسبت سے مختلف اُسلوب اختیار کرتے ہیں۔ اُنہوں نے آسان اور عام فہم زبان میں بھی خطوط لکھے ہیں۔ اُن کے بعض خطوط کی زبان علمی اور فارسی آمیز ہے اور بعض خطوط شعریت اور طنز وظرافت کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ بلند سے بلند مضامین کو شگفتہ اور دل نشیں پیرایے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کہیں خشکی اور بے لطفی کا احساس نہیں ہوتا۔ اُن کے بیش تَر خطوط ذات وکائنات کے عکّاس اور اسرارِ حیات کے دستاویز ہیں جن میں مولانا کی انفرادیت وانانیت، فلسفۂ نشاط وغم، مطالعۂ فطرت، مجتہدانہ خیالات اور زندگی کرنے کا بے پناہ حوصلہ نظر آتا ہے۔ بطورِ مثال پیش ہے اُن کے ایک خط کا یہ اقتباس:

''لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لئے کام میں لائیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مرجایئے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہئے۔ جس نے یہ مشکل حل کرلی اُس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔''

05.09 چند خطوط نگاروں کے خطوط کے اقتباسات

درج ذیل خطوط نگاروں کے خطوط کے اقتباسات سے خطوط نگاروں کے موضوعات، اسالیب، اندازِ بیان اور خطوط نگاری کی فنّی خصوصیات بڑی حد تک واضح ہوں گی۔ اگر آپ ان اقتباسات کا بہ غائرِ نظر مطالعہ کریں گے تو خطوط نگاری کے فن سے نہ صرف بخوبی واقف ہو جائیں گے بلکہ خطوط نگاری کے فن کے تئیں آپ کی دل چسپی میں بھی اضافہ ہوگا۔

مرزا غالبؔ

مرزا صاحب!

میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو، کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر وعافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ مرزا تفتہؔ نے ہاتھرس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور

انہوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھے خبر دی تھی کہ دو کتابوں کی طلائی لوح تیّار ہوگئی ہے۔ پھر اب اُن دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے؟ اور ان پانچ کتابوں کے تیّار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے، اسی ہفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔

اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے، ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین دن آگے پیچھے، یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں، تا خاص وعام کو جابہ جا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا، انہوں نے لکھ لیا، اُن دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوگئے۔ اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوالایا۔ اس نے وہ کاغذ مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلے میں اس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

سرسید احمد خاں

اب میرا حال سُنئے! مواعظِ احمدیہ کے لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا، آنا، ملنا، جُلنا سب بند ہے۔ آنحضرت کی بارہ برس کی عمر تک کا حال لکھ چکا اور ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کا جواب ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، مگر ایسا جواب نہیں جیسا کہ تمہارے ہاں کے کاملان مشرکین فی صفت النبوۃ دیتے ہیں۔ نہایت محقّقانہ جواب ہیں اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو۔ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام ورنہ میرا نام ہی نہیں۔ اپنی تحریر کو آپ ہی دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے.....بجز روپیہ کے اور کسی چیز کی فکر نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین کے پاس جائیں اور یہ میری درخواست ہے کہ دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپے قرض لیجیے۔ سود اور روپیہ میں ادا کروں گا۔ مگر چوں کہ میں یہاں ہوں اس لئے کچھ بندوبست نہیں کر سکتا۔ ہزار روپے بھیجنے کے لئے دلّی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروفِ مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔ اگر ہزار روپیہ آپ دونوں صاحب قرض لے کر مجھے بھیج دیں اور ہزار روپیہ یقینی دلّی سے آوے اور پانچ چھ سو روپیہ چندہ کے ذریعہ سے وصول ہو جاوے تو کتاب بخوبی چھپ جاوے گی.....کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے۔

الطاف حسین حالؔی

''پہلے اس سے کہ آپ کے عطیہ کا شکریہ ادا کروں، مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ جس نے مدّت دراز کے بعد آپ کی صحت کا مژدہ آپ ہی کی زبان سے سنوایا۔ فی الواقع آپ کی حالت نازک ہوگئی تھی اور مرض کو حد سے زیادہ امتزاد ہو گیا تھا باوجود یکے تبدیلی آب و ہوا کی بہت ضرورت تھی۔ مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا.....خدا تعالیٰ کو بھی آپ کی قومی خدمات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رکھنا منظور تھا فالحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ما انعم علینا بابقائکم فینا وبنعمۃ وجودکم لدینا (خدا کا مکرر شکر ہے کہ آپ کی زندگی اور نعمتِ وجود کی بدولت ہم پر احسان کیا۔)''

شبلی نعمانی

خاتونِ محترم-سلام علیکم

جنجیرہ کے سفر کا جو موقع جاتا رہا اس کا افسوس اس وقت تک رہے گا جب تک پھر ایسا موقع ہاتھ نہ آئے۔

آج دیوان اور سوانح مولانا روم بیچتا ہوں، نواب بیگم صاحبہ کو دو۔ جناب نواب صاحب کی خدمت میں جب پہنچوں گا تو تمام تصنیفات جو مل سکیں گی خود ہدیہ دوں گا۔ غائبانہ بیچنے کی ضرورت نہیں۔ ہمت نہیں ہوتی ورنہ یورپ کے سفر کا اچھا موقع تھا، آگرہ کے جانے اور مقامِ قیام اور مدّتِ قیام سے مطلع کروگی تو بہتر ہے۔

ندوہ کے کاغذاتِ انگریزی زہرا صاحبہ کو دے آیا تھا کہ تم کو دے دیں۔ ندوہ کا مقصد اسلام کی حمایت اور علوم دینی کی بقا ہے لیکن نہ اس طرح کہ جو پُرانے خیال کے مولوی چاہتے ہیں۔ پس گویا ندوہ مذہبی تعلیم کی اصلاحی صورت ہے۔ اس مسئلہ پر مفصّل گفتگو کرنا ہے تب اس کے مقصد کی اہمیت معلوم ہوگی۔ شکر ہے کہ اب گورنمنٹ نے بھی اس طرف توجّہ ظاہر کی ہے۔

ندوہ کا سالانہ جلسہ اپریل کی ۱۷ تاریخ کو غالباً ہوگا اگر کوئی شخص وہاں سے شریک ہوتا تو لطف ہوتا اگر اس خط کا جواب آیا تو بہت سی ضروری باتیں تم کو لکھنی ہیں جن میں سے اکثر تمہارے مشن کے فوائد سے متعلق ہیں۔

شبلی نعمانی-ندوہ، لکھنؤ ۱۷ فروری ۱۹۰۸ء

مہدی افادی

شکار کے نہایت شوقین ہیں۔ ایک روز معلوم ہُوا کہ صبح کے نکلے دو (۲) بجے واپس آئیں گے یعنی چاشت ندارد۔ لنچ پر کسر نکالی جائے گی۔ دو لیڈیاں بھی ساتھ تھیں۔ بجلی کی طرح ایک خیال آیا۔ جنگل میں ٹھیک بارہ بجے ایک چپراسی سادہ لباس میں ایک چھوٹی سی میز پر ضروری سامان آراستہ کر رہا تھا اور متوقع آمد کا انتظار کر رہا ہے کہ دفعتاً شکاری ہاتھیوں پر نظر آئے۔ جو باوجودِ کامیابی خستہ ہو رہے تھے۔ ہاتھی فوراً بٹھائے گئے اور سب کے سب مہمان ناخواندہ کی طرح میز پر ٹوٹ پڑے۔ درد کی درد تھی کہ میر قافلہ نے خود کہا تحصیل دار صاحب نے بھیجا ہے۔ چپراسی کا مودّبانہ جواب یہ تھا کہ عرض کرنے کی اجازت نہیں ہے (زور کا قہقہہ) واپس آئے تو متبسّمانہ چہروں نے ظاہر کر دیا کہ راز کی پردہ دری ہو چکی اور ایک خاتون کی جنس لبِ شکریہ سے گراں بار نظر آئی۔ یہ میرا صلہ تھا، غلطی نہ کیجے گا۔ ہر تحصیل دار کا نہیں۔؟

ابوالکلام آزاد

قلعۂ احمد نگر

۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرّم!

بچّے ربڑ کے رنگین غُبّاروں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ مجھے بھی بچپنے میں اُن کا بڑا شوق تھا۔ والدِ مرحوم کے مُریدوں میں ایک شخص غُلام رحمٰن تھا، جو انگریزی ٹوپیوں کے بنانے کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ مجھے غبّارے لا دیا کرتا اور مَیں اُس سے بہت ہِل گیا تھا۔ یہ غُبّارے ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے مُنھ سے پھونکنے کے ہوتے ہیں، لیکن اِن میں گیس بھر دی جاتی ہے اور وہ اِنہیں اوپر کی طرف اُڑائے رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ

مجھے خیال ہُوا، اِسے چھید کے دیکھنا چاہیے، اندر سے کیا نکلتا ہے! سہسرام کی ایک مُغلانی اماّنی نام، ہمارے گھر میں سِلائی کا کام کیا کرتی تھی۔ مَیں نے اماّنی کے سِلائی بکس سے ایک سوئی نکالی اور غُبّارے میں چبھودی۔ اِس واقعہ پر سینتالیس برس گُزر چُکے ہیں، لیکن اِس وقت بھی خیال کرتا ہوں تو اُس سنسنی کا اثر صاف صاف دِماغ میں محسوس ہونے لگتا ہے، جو اُس وقت اچانک گیس کے نکلنے اور ایک لمبی سی سہ کی سی آواز پیدا ہونے سے مجھ پر طاری ہوگئی تھی۔ گیس باہر نکلنے کے لئے کچھ ایسی بے تاب تھی کہ سوئی کا ذرا سا چھید پاتے ہی فوراً فوّارہ کی طرح مُضطر بانہ اُچھلی اور دو تین سکنڈ بھی ابھی نہیں گُزرے تھے کہ غُبّارہ خالی ہو کے سکُڑ گیا اور زمین پر گر گیا۔

یقین کیجیے، آج کل بعینہٖ ایسا ہی حال اپنے سینہ کا بھی محسوس کر رہا ہوں۔ غُبّارے کی طرح اِس میں بھی کوئی پُر جوش عُنصر ہے، جو بھر گیا ہے اور نکلنے کے لئے بے تاب ہے۔ اگر کوئی ہاتھ ایک سوئی اُٹھا کر چُبھو دے، تو مجھے یقین ہے، اِس میں سے بھی ویسا ہی جوش اُمنڈ کر اُچھلے گا، جیسا غُبّارہ سے ایک مُضطرب چیخ کے ساتھ اُچھلا تھا۔

رشید احمد صدیقی

۳ر نومبر ۱۹۷۰ء

نظامی صاحب مکرم، آداب

خطبہ (؟) نظرِ ثانی اور چند اوراق کے اضافے کے بعد بھیجتا ہوں۔ اضافہ اس لئے کیا گیا کہ ڈاکٹر علیم صاحب نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا تھا کہ گزشتہ کے بارے میں کافی ہے لیکن حال تشنہ ہے۔

ایک نظر آپ بھی ڈال لیں۔ ممکن ہے کوئی بات حذف کر دینے کے قابل ہو، اسے حذف کر دیا جائے گا۔ یوں بھی آپ دیکھ لیں گے تو اطمینان ہو جائے گا۔ چاہتا یہ تھا کہ جو صفحات ہاتھ سے لکھے ہیں اُن کو کسی خوشنویس سے لکھوا کر بھیجتا تا کہ کاتب کو آسانی ہوتی اور کتابت کی غلطیاں بھی کم ہوتیں، لیکن اس سلسلہ میں اتنا خرچ آپ سے کرا چُکا ہوں کہ اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اُمید ہے یوں ہی کام چل جائے گا۔

مخلص رشید احمد صدیقی

آپ کے یہاں سے کوئی ایسا دہلی جانے والا نہ مل سکے گا جو خواجہ فاروقی صاحب کو دہلی یونیورسٹی میں ایک **Thesis** پہنچا دے اسے میں دیکھ چُکا ہوں۔ مدّتوں سے میرے پاس رکھّی ہوئی ہے۔ جلدی بھی نہیں ہے۔ مثلاً ۲، ۳ ہفتے میں؟

05.10 خلاصہ

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا خیال ہے کہ جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے اُسے دو لوگوں تک پہنچانا، گفتگو کو تحریر کا، مکالمہ کو مراسلہ کا جامہ پہنانا ہے۔ مختلف مقامات پر موجود دو افراد کی تحریری گفتگو کو خط کی مختصر سے مختصر اور جامع تعریف کہا جا سکتا ہے۔ خطوط نگاری باقاعدہ ایک فن ہے۔ خط کو ''نصف ملاقات'' کہا گیا ہے۔ بعض وجوہات کی بِنا پر جو باتیں دو بدو نہیں کہی جا سکتی ہیں اُنہیں خطوط میں تحریر کیا جا سکتا ہے۔ خط میں کوئی ایسا اُسلوبِ بیان نہ ہونا چاہیے جسے گفتگو میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ طویل القاب و آداب اور بغیر خواہش ظاہر کیے ہوئے اپنی خیریت بتانا اندازِ گفتگو کے خلاف ہے۔ اگر مزاج پرسی یا خیریت پُرسی لکھنا ضروری ہو تو آخر میں کرنا چاہیے۔

ابتدا میں خطوط صرف ضرورت کے اظہار کے لئے لکھے جاتے تھے۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ خطوط نگاری کی ابتدا انفرادی طور پر

ہوئی یا مذہب اور حکومت کے علَم برداروں کے ذریعہ وجود میں آئی۔ خلافتِ اُمّیہ اور خلافتِ عبّاسیہ میں خطوط نگاری نے باقاعدہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ عہدِ مغلیہ میں خطوط فارسی زبان میں لکھے جانے لگے۔ فارسی خطوط نگاری ایران سے زیادہ ہندوستان میں پروان چڑھی۔ ایک زمانہ تک فارسی خطوط کی تقلید میں اُردو کے خطوط میں بھی القاب وآداب تحریر کیے جاتے رہے۔

قیاس ہے کہ خطوط نگاری کا آغاز سرزمینِ روم میں ہوا ہوگا۔ انگلستان میں خطوط نگاری کا باوا آدم جیمز ہاول کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ولیم کوپر، گرے اور میری ارٹلے مانٹیگ کا شمار انگریزی کے مشہور خطوط نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ چارلس لیمب، کیٹس، شیلی اور بائرن نے بھی عمدہ خطوط لکھے ہیں۔ اُردو خطوط نگاری کا اوّلین دَور فارسی زبان کی خطوط نگاری کے انداز سے متاثر نظر آتا ہے۔ افتخار الدّین علی خاں شہرتؔ کو اُردو کا پہلا خط نگار تسلیم کیا جانا چاہیے۔ رجب علی بیگ سرورؔ، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، غلام غوث بے خبرؔ، سرسیّد احمد خاں، خواجہ الطاف حُسین حالیؔ، علاّمہ شبلیؔ نعمانی، مولانا محمد حُسین آزادؔ، امیر مینائی، اکبر الہ آبادی، مہدی افادی، پریم چند، سعادت حسن منٹوؔ، پطرسؔ بخاری، چودھری محمد علی، علاّمہ اقبالؔ، مولوی عبدالحق، سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولانا محمد علی جوہرؔ، جوشؔ ملیح آبادی، نیازؔ فتح پوری، سجّاد ظہیر اور پروفیسر گیان چند جین اُردو کے اہم خطوط نگار ہیں۔ خطوط کی اہمیت وافادیت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں جن میں سے ادبی اہمیت، تاریخی اہمیت اور سوانحی اہمیت نہایت اہم ہیں۔ مختلف خطوط نگاروں کے خطوط کے موضوعات واسالیب بھی مختلف ہوتے ہیں جس کا اندازہ مختلف خطوط نگاروں کے خطوط کے مطالعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

05.11 فرہنگ

آراستہ کرنا : سلیقہ سے لگانا

آگے ڈال دینا : سامنے رکھ دینا، پیش کر دینا

ارشاد کرنا : کہنا، فرمانا

امتداد ہونا : طویل ہونا، ایک مدّت گزر جانا

ایک نظر ڈالنا : سرسری نظر سے دیکھنا، نگاہ کرنا، دیکھنا

بعینہٖ : ہو بہو، بالکل

بیان سے باہر ہونا : مفصّل کیفیت ادا نہ ہو سکنا

بے چینی : مضطرب

بے دین : بد مذہب، بے ایمان، جس کا کوئی دین نہ ہو

بیورا : تفصیل

پُرانے خیال کا : دقیانوسی، قدیم وفرسودہ رسم ورواج کا پابند

پردہ دری ہونا : راز ظاہر ہونا، راز افشا ہونا

زمزمہ پرداز : زمزمہ خواں، زمزمہ سنج، راگ گانے والا

سود : قرض دی ہوئی رقم پر نفع، بیاج

شب وروز : رات دن، ہر وقت

طلائی لوح : سنہری جلد، سنہرا سرِ ورق

ظروفِ مِسی : تانبے کے برتن

عنایتی : عنایت کی ہوئی، عطا کی ہوئی

قدیم : پرانا

قسم کھانا : عہد کرنا، حلف اُٹھانا

کام چل جانا : کام ہو جانا، کسی طرح مسئلہ حل ہو جانا

کسر نکالنا : کمی پوری کرنا، خسارہ پورا کرنا

کلام : شعر، سخن

گراں بار : بھاری بوجھ میں لدا ہوا

لنچ : دوپہر کا کھانا، چاشت کا کھانا، Lunch

تھیسِس : Thesis، تحقیقی مقالہ

ٹوٹ پڑنا : پِل پڑنا، کسی کام میں ہمہ تن مصروف ومشغول ہونا

جاتا رہنا : باقی نہ رہنا، ختم ہونا

جی میں آنا : ذہن میں آنا، خواہش ہونا

چاشت : وہ نماز جو پہر دن چڑھے پڑھی جاتی ہے

حذف کرنا : خارج کرنا، نکالنا، ہٹانا

خستہ ہونا : تھک جانا، مضمحل ہونا

خواب وخورحرام ہونا : کسی فکر یا تکلیف کی وجہ سے نیند نہ آنا اور کھانا پینا چھوٹ جانا

خوش آواز : خوش آہنگ، اچھّی آواز والا

خوش نویس : کاتب، خوش رقم، اچھّا لکھنے والا

خیال کرنا : سوچنا، غور کرنا

دیکھ چُکنا : جانچ لینا، قدر وقیمت کا اندازہ لگالینا

دیوان : حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا کسی شاعر کے کلام کا مجموعہ

رونا آنا : دل بھر آنا، افسوس ہونا، آنکھیں نم ہوجانا

لوح : سرِ ورق، وہ بیل بوٹے جو کسی کتاب کے شروع میں بنائے جاتے ہیں

متبسّمانہ : شگفتہ، مُسکراتا ہوا

مضطربانہ : بے قراری سے، بے چینی کی حالت سے

مغلانی : کپڑے سینے والی عورت، درزِن

مِلنا جُلنا راہ ورسم، ملاقات

منہائی : کٹوتی، کمی، Discount

مواعظ : موعظت کی جمع، نصائح، نصیحتیں

مہاجن : سیٹھ، ساہوکار، سود کے عوض قرض دینے والا

مہمانِ ناخواندہ : بِن بُلائے مہمان، وہ مہمان جسے مدعو نہ کیا گیا ہو

نازک ہونا : کمزور ہونا

ندوہ : انجمن، مجلس، سبھا لکھنؤ کے ایک ادارہ کا نام

نظرِ ثانی : دوبارہ دیکھنا، ترمیم یا تصحیح کی غرض سے دوبارہ دیکھنا

ہدیہ : تحفہ، نذرانہ

ہِل جانا : مانوس ہوجانا

05.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ غالبؔ کے خطوط کے اسلوبِ خاص کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۲ خط کی مختصر سے مختصر اور جامع تعریف کیا ہوسکتی؟ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ خط کو ''نصف ملاقات'' کیوں کہا جاتا ہے؟ اظہارِ خیال کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ اُردو خطوط نگاری کی روایت کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ خطوط کی اہمیت وافادیت پر ایک مضمون تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ خط کی تعریف کیجیے اور خطوط نگاری کے فن پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : اُردو خطوط نگاری کا اوّلین دَور کس زبان کی خطوط نگاری سے متاثر نظر آتا ہے؟

(الف) عربی (ب) فارسی (ج) ہندی (د) ترکی

سوال نمبر۲ : اُردو کا پہلا خط نگار کسے تسلیم کیا جانا چاہیے؟

(الف) جان تپش (ب) راجہ رام موہن رائے (ج) راسخؔ عظیم آبادی (د) افتخارالدّین علی خاں شہرتؔ

سوال نمبر۳ : مرزا غالبؔ کے خطوط کے مجموعہ کا نام کیا ہے؟

(الف) انشائے سرور (ب) عودِ ہندی (ج) تبرّکاتِ آزادؔ (د) مکاتبِ حالیؔ

سوال نمبر۴ : خطوط نگاری کا آغاز کہاں ہوا؟

(الف) روم (ب) یونان (ج) ہندوستان (د) مصر

سوال نمبر۵ : درج ذیل میں سے کون سا خطوط کا مجموعہ ابوالکلام آزادؔ کا نہیں ہے؟

(الف) کاروانِ خیال (ب) نقشِ آزادؔ (ج) اردوئے معلّٰی (د) غبارِ خاطر

سوال نمبر۶ : انگلستان میں خطوط نگاری کا باوا آدم کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

(الف) جیمز ہاول (ب) چارلس لیمب (ج) ولیم کوپر (د) کیٹس

سوال نمبر۷ : ''مَیں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا'' یہ جملہ کس خطوط نگار کے خط سے ماخوذ ہے؟

(الف) ابوالکلام آزادؔ (ب) سرسید احمد خاں (ج) مرزا غالبؔ (د) الطاف حُسین حالیؔ

سوال نمبر۸ : درج ذیل میں سے ''نصف ملاقات'' کا مقولہ کس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے؟

(الف) خاکہ (ب) خط (ج) انشائیہ (د) سوانح

سوال نمبر۹ : عہدِ مغلیہ میں خطوط کس زبان میں لکھے جاتے تھے؟

(الف) سنسکرت (ب) اردو (ج) فارسی (د) عربی

سوال نمبر۱۰ : مرزا غالبؔ کے خطوط کے مجموعہ ''عودِ ہندی'' کے مرتّب کا نام کیا ہے؟

(الف) الطاف حُسین حالیؔ (ب) مولوی عبدالحق (ج) حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (د) غلام غوث بے خبرؔ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) فارسی
جواب نمبر۲ : (د) افتخارالدّین علی خاں شہرتؔ
جواب نمبر۳ : (ب) عودِ ہندی
جواب نمبر۴ : (الف) روم
جواب نمبر۵ : (ج) اردوئے معلّٰی
جواب نمبر۶ : (الف) جیمز ہاول
جواب نمبر۷ : (ج) مرزا غالبؔ
جواب نمبر۸ : (ب) خط
جواب نمبر۹ : (ج) فارسی
جواب نمبر۱۰ : (د) غلام غوث بے خبرؔ

05.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو نثر کا فنّی اِرتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۲۔ خطوطِ غالبؔ کے ادبی مباحث از ڈاکٹر مشیر احمد

۳۔ رشید احمد صدّیقی کے خطوط از آل احمد سرورؔ

۴۔ غالبؔ شاعر و مکتوب نگار از پروفیسر نورالحسن نقوی

۵۔ مکاتبِ مہدی از مہدی افادی

اکائی 06 : اُردو کے اہم خطوط نگار

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد

06.02 : تمہید

06.03 : مرزا اسداللہ خاں غالب

06.04 : سرسیّد احمد خاں

06.05 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی

06.06 : شبلی نعمانی

06.07 : مہدی افادی

06.08 : ابوالکلام آزادؔ

06.09 : رشید احمد صدّیقی

06.10 : خلاصہ

06.11 : فرہنگ

06.12 : سوالات

06.13 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

آپ بخوبی واقف ہیں کہ خطوط نگاری نے نثری صنف ادب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔اُردو ادب کے نثری سرمایہ میں متعدد خطوط نگاروں کے خطوط کے مجموعے قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ دراصل خطوط ایسا آئینہ ہوتے ہیں جن میں خطوط نگار کے ذہنی میلانات کے ساتھ ساتھ اُس عہد کے معاشرتی وسیاسی رجحانات وحالات، ادبی صورتِ حال اور دیگر مسائل کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔خطوط نگاری کے میدان میں متعدد خطوط نگار منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔جن کے فن، اسلوب اور خطوط نگاری سے متعلّق اُردو کے ہر طالبِ علم کو واقفیت ہونا چاہیے۔اسی اغراض ومقاصد کے تحت اس اکائی میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، سرسیّد احمد خاں، خواجہ الطاف حُسین حالؔی، شبلی نعمانی، مہدی افادی، ابوالکلام آزادؔ، رشید احمد صدّیقی کی خطوط نگاری کے موضوعات، اسلوب اور بنیادی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

06.02 تمہید

آپ اچھّی طرح واقف ہیں کہ خطوط لکھنا ضرورت بھی ہے اور شوق بھی ہے مگر دورِ حاضر میں خطوط نگاری کا ذوق رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ جدید ذرائع ترسیل و ابلاغ یعنی Modern Information Technology سے خط و کتابت کی روایت میں کمی آ گئی ہے۔ اس کمی کے باوجود دورِ حاضر میں خطوط نگاری کی روایت میں بعض قلم کار قابلِ قدر اضافہ کرنے میں منہمک ہیں۔ اُردو خطوط نگاری میں غالبؔ کے خطوط سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رجب علی بیگ سرورؔ، مرزا غالبؔ، غلام غوث بے خبرؔ، سرسیّد احمد خاں، شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حُسین حالیؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی، مہدی افادی، مولوی عبدالحق، علاّمہ اقبال، عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ، رشید احمد صدّیقی، سعادت حسن منٹو، پطرس بخاری وغیرہ کا شمار اُردو کے اہم اور منفرد خطوط نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

اُدَبا، شعرا اور دانش وَروں کے خطوط کے ذریعہ ایسی معلومات بھی فراہم ہو جاتی ہیں جنہیں کسی اور ذرائع سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے خطوط نگاروں کی خطوط نگاری کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس اکائی میں جن خطوط نگاروں کو شامل کیا گیا ہے اُن میں سے سبھی خطوط نگار منفرد و ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔

06.03 مرزا اسداللہ خاں غالب

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے خطوط نگاری کا آغاز فارسی میں کیا تھا مگر کبھی کبھی وہ اُردو میں بھی خطوط لکھ لیا کرتے تھے۔ جب کچھ لوگوں نے اُن کے اُردو خطوط کی تعریف کی تو وہ باقاعدہ طور پر اُردو میں خطوط لکھنے لگے۔ اُنہوں نے تقریباً ۱۸۴۶ء میں اُردو زبان میں خطوط لکھنا شروع کیا۔ قلم برداشتہ یعنی سرسری طور پر لکھے گئے غالبؔ کے یہی خطوط اُردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اُن کے خطوط کے اب تک کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام عودِ ہندی، اُردوئے معلّیٰ، مکاتیبِ غالبؔ، خطوطِ غالبؔ اور نادر خطوط غالبؔ ہیں۔

غالبؔ ایک انقلابی مزاج کے مالک تھے اور عام روش سے ہٹ کر چلنا پسند کرتے تھے۔ اُنہوں نے مراسلت کے اُن تمام قاعدوں سے انحراف کیا جو محمد شاہ کے وقت تک رائج تھے یعنی اُنہوں نے عبارت آرائی، بے جا لفّاظی تصنع اور بناوٹ کے بجائے آسان اور عام بول چال کی زبان میں خطوط نگاری کی ابتدا کی۔ وہ اپنے دل کی بات کو تمہید کے بغیر لکھنا شروع کر دیتے تھے اور گفتگو کے انداز میں اس طرح خطوط لکھتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی قریب بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ طویل آداب والقاب کے بجائے وہ کبھی میاں، بھائی، مہاراج، صاحب، برخوردار، میری جان، جانِ غالبؔ، بندہ پرور، قبلہ و کعبہ، بھائی صاحب اور کبھی مکتوب الیہ کا نام لکھ کر حال بیان کرنے لگتے ہیں۔ اُنہوں نے خود لکھا ہے کہ ''مجھ کو محمد شاہی روشیں پسند نہیں۔ خطوط میں تو دل کی بات لکھنا چاہتا ہوں'' ایک جگہ اُنہوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ''یہ خطوط کتابت نہیں، بے تکلّف بات چیت ہے''۔

ایک خط میں اُنہوں نے اپنی خطوط نگاری کی خصوصیت کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

> ''مَیں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

غالبؔ کے خطوط اُن کی زندگی کا آئینہ ہیں۔اُنہوں نے اپنی زندگی اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو بڑی بے تکلّفی سے اُجاگر کیا ہے۔ شراب نوشی کی لَت ہو یا جُوا کھلانے کے جُرم میں جیل جانے کا واقعہ، پینشن بند ہونے اور دوبارہ جاری ہونے کی روداد ہو یا ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھنے کا کارنامہ، ایّامِ تنگ دستی کے واقعات ہوں یا دیگر معاملات غرض اُن کے خطوط اُن کی زندگی کی کھُلی کتاب ہیں۔

جیسا کہ درج ذیل خط سے بھی واضح ہے:

''میرا حال اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔سوگاہ گاہ جب دل اُلٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چُپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگِ ناگہاں !! تجھے کیا انتظار ہے؟

غالبؔ نے اپنے خطوط میں کسی کی مدح سرائی کی ہے تو کسی کی مذمّت، کسی سے ہم دردی کا اظہار کیا ہے تو کسی کی مخالفت بھی کی ہے، کہیں اُن کی اَنانیت نے کسی کو کہیں کا نہیں رکھّا ہے تو کہیں اُن کی مہربانیوں نے کسی کو ذرّے سے آفتاب بنا دیا ہے۔اُن کے خطوط میں معاصر تاریخ، سیاسی واقعات، ادبی مباحث بھی ہیں اور مذہبی مسائل اور عمیق فلسفیانہ حقائق بھی ہیں۔ وہ ان خطوط میں کہیں رجائی بن کر زندگی کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں تو کہیں قنوطیت میں مبتلا ہو کر زندگی سے بیزاری کا اظہار بھی کرتے ہیں۔اُنہوں نے اپنے خطوط کے ذریعہ کٹّر پن کی تضحیک بھی کی ہے تو کہیں سنجیدہ مسائل اور اہم باتوں کو چٹکیوں میں بھی اُڑا دیا ہے۔غرض غالبؔ کے خطوط اُن کی سرگزشتِ حیات بھی ہیں اور بہت سے مسائل کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہیں۔اُن کے خطوط میں شوخی وظرافت اور بذلہ سنجی بھی جابجا نظر آتی ہے۔کسی نے غالبؔ سے روزہ نہ رکھنے کا سبب دریافت کیا تو اُسے جواب میں لکھتے ہیں:

''روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی ایک کٹورا پانی پی لیا، کبھی حقّہ کا کش لگا لیا، کبھی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا اور یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔مَیں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا، یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔''

غالبؔ کے ایک شاگرد کی تیسری بیوی کا انتقال ہو گیا تو اُنہوں نے اُس کے نام ایک خط اس طرح لکھا:

''اللہ اللہ ایک وہ لوگ ہیں کہ تین تین دفعہ اس قید سے چھوٹ چکے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اگلے پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دَم ہی نکلتا ہے۔''

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کے خطوط اُن کی زندگی اور اُن کے عہد کا اشاریہ ہیں۔وہ موقع ومحل کے اعتبار سے جس منظر کا نقشہ کھینچتے ہیں اُس کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔اُن کے خطوط میں اُن کے مزاج کی شوخی اور مزاح جابجا مترشح ہے اور بعض خطوط ادبی،

علمی اور فلسفیانہ مباحث کا بہترین نمونہ ہیں۔ آخر میں اُن کے بعض خطوط کے مختصر اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں تا کہ غالبؔ کے اسلوبِ خاص سے مزید واقفیت ہو سکے :

☆مَیں جب حور کا تصوّر کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامتِ جاوید انی ہے اور اُسی نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصوّر سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔

☆کبھی اُٹھتا ہوں تو بہ تکلّف اتنی دیر میں، جتنی دیر میں قدِ آدم دیوار اُٹھتی ہے۔

☆قاسم جان کی گلی، خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔

☆اگر زندگی ہے اور مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔

☆میاں تمہارے دادا تو میاں امین الدّین خاں بہادر ہیں۔ مَیں تو تمہارا دلدادہ ہوں۔

☆بھئی! کیسی وبا؟ جب ایک ستّر برس کے بُڈّھے اور ستّر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف بدیں وبا۔

☆دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں کہ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب کہا جائے گا تو یہ کہو گے مَیں نے دوسرے دن ہی جواب لکھ دیا تھا۔

☆اس چرخِ کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ مُلک و مال، جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔

06.04 سرسیّد احمد خاں

سرسیّد احمد خاں سماجی مُصلح، تعلیمی رہنما اور مسلمانوں کی ترقّی کے خواہاں تھے۔ اُنہیں شدّت سے احساس تھا کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیمی رجحان کا فقدان رہے گا وہ ترقّی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے اُنہوں نے تعلیم پر زیادہ توجّہ دی۔ ایک مُصلحِ قوم کی حیثیت سے اُن کا درجہ بہت بلند ہے۔ اُن کے بیش تر خطوط اُن کے انہیں نظریات کے حامل ہیں۔ اُن کے خطوط کا مجموعہ 'مکاتبِ سرسیّد' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اُن کے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دردمندی، خلوص، اُنس اور ہم دردی کا پیکر تھے۔ قوّتِ ایمانی اور حُبِّ اسلامی اُن کی رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اسلام کو نہ صرف دینِ فطرت سمجھتے تھے بلکہ اُس پر پختہ یقین بھی رکھتے تھے۔ اُنہوں نے متعدد خطوط کے ذریعہ مذہبِ اسلام کو دین و عقل اور فطرت کا مذہب ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جس کے ثبوت میں مولوی محمد حُسین آزادؔ کو لکھے گئے اُن کے ایک خط کی درج ذیل سطور کافی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''اس بات کے کہنے سے مجھے معاف کیجیے کہ یہ خیال آپ کا کہ قرآن میں کوئی مضمون علمی نہیں، خالص فصاحت اس کا معجزہ ہے، درست نہیں ہے۔ قرآن علم و نیچر اور فصاحت سب سے محمود ہے اور مجموع من حیثیت المجموع معجزہ ہے۔''

مسلمانوں کے لئے کالج قائم کرنے سے پہلے سرسیّد احمد خاں نے انگلستان کا سفر اس لئے کیا تھا کہ وہ وہاں کے نظامِ تعلیم و تربیت کا خود مطالعہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ وہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں مخزون اُن کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہتے تھے جو سر ولیم

میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب لکھنے میں معاون ثابت ہوسکتی تھیں۔ سر ولیم میور نے اپنی تصنیف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اور مذہبِ اسلام پر اتہام والزام لگائے ہیں۔ سرسیّد نے انگلستان سے نواب محسن الملک کو کئی خطوط لکھے جن میں سر ولیم میور کی کتاب کا جواب تیّار کر کے ایک کتاب شائع کرانے کا ذکر ہے۔ وہ ۲۰ راگست ۱۸۶۹ء کے ایک خط میں رقم طراز ہیں کہ:

''ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں حضرت کے حال میں لکھی ہے اُس کو مَیں دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دل کو جلا دیا اور اُن کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہے اور مصمّم ارادہ کرلیا کہ آں حضرت کی سیرت میں سب کچھ خرچ ہو جائے اور مَیں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔''

قیامِ لندن کے دوران سرسیّد احمد خاں نے انگریز مصنفوں جان ڈیون پورٹ کی کتاب ''اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن'' اور ہینگر کی کتاب ''گاڈ فری'' دیکھیں جو مذہبِ اسلام کی حمایت میں لکھی گئی تھیں۔ وہ ان کتابوں کی اشاعت کے حددرجہ خواہاں تھے۔ جان ڈیون پورٹ کی کتاب کے متعلّق اُنہوں نے ۶ راگست، ۱۸۶۹ء کو نواب محسن الملک کے نام ایک خط لکھا جس کی عبارت درج ذیل ہے:

''ایک انگریز نے جس کا نام مسٹر جان ڈیون پورٹ ہے، حمایتِ مذہبِ اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے۔ جنابِ پیغمبر خدا صلعم کا حال لکھا ہے اور جس قدر اتہام والزام انگریزوں نے آں حضرت صلعم پر اور مذہبِ اسلام پر لگائے ہیں اُن کا جواب دیا ہے۔ چوں کہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی۔ اس کا چھاپہ جانا اور فروخت ہونا مشکل تھا۔ مَیں نے کُل لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی اور احباب سے پچاس پچاس روپیہ اُس کی لاگت ادا کرنے کو طلب کیے تھے۔ اگر وہ خط نہ پہنچا ہو تو اب فی الفور پچاس روپیے بھیج دو۔ وہ کتاب تیّار ہو گئی، چھپ چکی۔ آئندہ میل میں روانہ کروں گا۔''

۲۶ رنومبر ۱۸۷۹ء کے خط میں مسٹر ہیگنز کی کتاب کے متعلّق وہ نواب محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ:

''نہایت مشکل سے مَیں نے ایک کتاب اور مسٹر ہیگنز کی تلاش کی ہے۔ اُس کے صرف ایک مرتبہ چند نسخے چھاپے گئے تھے۔ وہ کتاب ایسی عمدہ ہے کہ مسٹر ڈیون پورٹ کی کتاب اس کے آگے آفتاب وستارہ کی نسبت رکھتی ہے۔''

سرسیّد جس قدر مذہبِ اسلام کی حمایت کرتے تھے اُسی قدر اُن کے دل میں مسلمانوں کی خیرخواہی کا جذبہ بھی تھا۔ اُنہوں نے مسلمانوں اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ اگرچہ علماے ہند کی ایک جماعت سرسیّد کی وفات تک اُن کی مخالفت کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اُنہیں زندیق اور کافر بھی قرار دیا گیا مگر وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے اور نہایت صبر و تحمّل سے اُن کی مخالفت کا سامنا کرتے رہے۔ وہ کبھی کبھی خطوط کے ذریعہ اپنے غم وغصّہ کا اظہار بھی کر دیتے تھے اور اُن کے بعض مخلص، ہم درد اور دوست اُن کی حمایت میں مضامین لکھ کر شائع کرا دیا کرتے تھے مگر سرسیّد اُنہیں سمجھانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ جیسا کہ نواب محسن الملک کو لکھے گئے ایک خط کی درج ذیل سطور سے بھی ظاہر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لوگوں نے اخباروں میں جو مجھے بُرا بھلا لکھا اُس سے آپ کو غصّہ آ گیا۔ معلوم نہیں کہ آپ نے آرٹیکل میں کیا لکھا ہوگا مگر مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے۔ مَیں ہدفِ تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آوے گا جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں۔''

سرسیّد احمد خاں بلا کے شوخ اور ظریف بھی تھے۔ اُن کے متعدد خطوط طنز و مزاح کے بہترین نمونے ہیں بغیر ذبح کی ہوئی مُرغی کھانے کے ذکر میں وہ نواب محسن الملک کو دعائیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اوخدا! تو اُن کا بھی خدا ہے جو حلال کی ہوئی مُرغی کھاتے ہیں اور اُن کا بھی خدا ہے جو گردن مروڑی ہوئی مُرغی کھاتے ہیں۔ مجھ مَری مُرغی کھانے والے کی دعا قبول کر۔''

نواب محسن الملک کو لکھا ہوا یہ خط بھی سرسیّد احمد خاں کے طنزیہ و مزاحیہ مزاج کا عکّاس ہے:

''تبدیلِ وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ سب بجا ہے۔ بشرطیکہ میرا جادو، توبہ توبہ میرا معجزہ، نعوذ باللہ، میری کرامت، لاحول ولاقوۃ الّا باللہ میری حماقت تم میں اثر نہ کرے گی۔ ذرا صبر کرو، تین مہینے خیر سے گزر جاویں جب الٰہ آباد کے اسٹیشن پر گلے ملو گے اور چھاتی سے چھاتی ملے گی اُس وقت پوچھیں گے کہ جانِ من (معاف کیجیے بے خودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلۂ من اب کیا ارشاد ہے؟''

سرسیّد احمد خاں طنز و مزاح کے پیرایے میں ایسی معنی خیز باتیں لکھ جاتے ہیں جو نہ صرف قارئین کے دل و ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں بلکہ اُنہیں سوچنے کے لئے بھی مجبور کر دیتی ہیں۔ وہ مولانا محمد ابراہیم آروی کو ایک خط اس طرح لکھتے ہیں:

''مولوی مہدی علی کو میری مخالفت سے تو اس قدر فائدہ ہوا کہ آپ کی جماعت کے لوگوں نے اُن کو اچھّا سمجھا لیکن اگر یہ ہمارے موافق ہوتے تو زیادہ رتبہ پاتے کہ فرشتے بھی اُن کو اچھّا سمجھتے۔''

آخر میں مولانا محمد ابراہیم آروی کو لکھے گئے ایک خط کی چند سطور بھی درج ہیں:

''آپ کو معلوم نہ ہوگا مگر آپ معاف فرمایئے گا کہ مَیں نے وہابیوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک وہابی، دوسری وہابی اور کریلا، تیسرے وہابی کریلا اور نیم چڑھا۔ مَیں اپنی تئیں تیسرے قسم میں قرار دیتا ہوں۔''

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سرسیّد احمد خاں کے خطوط کی نمایاں خصوصیات دردمندی اور خلوص ہیں۔ اُن کے خطوط میں وہی شخصیت جھلکتی ہے جو اُن کے رسالہ تہذیب الاخلاق میں نظر آتی ہے یعنی وہ معلّمِ اخلاق اور مُصلح کی حیثیت سے ہر جگہ نمایاں ہیں۔

06.05 خواجہ الطاف حُسین حالؔی

بحیثیت شاعر، نقّاد اور سوانح نگار خواجہ الطاف حُسین حالؔی کا جو مقام و مرتبہ ہے اُس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں مگر خطوط نگار کی حیثیت سے اُن کا ذکر کم کیا جاتا ہے۔ جب کہ اُنہوں نے بہت سے خطوط لکھے ہیں۔ اُن کے خطوط کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اُن کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتبِ حالؔی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ''مکاتبِ حالؔی'' کے مطالعہ سے حالؔی کی شخصیت، ادبی کارناموں اور اُن کی زندگی سے متعلّق گہری واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اُن کے خطوط نہایت مفید، کارآمد اور بصیرت افزا ہیں۔ اُن کے بیش تر خطوط نجی یعنی ذاتی ہیں

جو گھریلو معاملات، عزیزوں کی مزاج پُرسی، احباب و متعلّقین کے مشاغل، امراض کی روداد، بچّوں کی تعلیم و تربیت، ملازمت، شادی بیاہ، مکانات کی تعمیر و مرمّت جیسے مضامین و امور سے متعلّق ہیں۔ اسی طرح کے معاملات ہر شخص کو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ ان خطوط کی تحریروں میں خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی بے تکلّف اور سنجیدہ شخصیت کی پوری طرح جلوہ گری ہے۔

حالؔی کے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہیں اپنے گھر کے افراد اور احباب سے بے پناہ محبت و انسیت تھی۔ اُنہیں ہر ایک کی خیریت، صحت، تربیت، تعلیمی کیفیت، معاشی حالات، اخلاقی روش وغیرہ کا ہر لمحہ خیال رہتا تھا۔ وہ اپنے علمی اور تصنیفی مشاغل کے باوجود خاندانی معاملات سے کبھی بے خبر نہیں ہوئے۔ جب اُنہیں اپنے بھائی کے انتقال کی خبر موصول ہوئی تو اُنہوں نے دل برداشتہ ہو کر ایک خط لکھا جس کی چند سطور اس طرح ہیں:

''اس وجہ سے کہ اس قحط الرّجال کے زمانے میں جب کہ نیک آدمی دنیا سے مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے خاندان سے ایسے شخص کا اُٹھ جانا جو نہ صرف ہمارے گھر میں بلکہ تمام قصبہ میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ اُن کی وفات ایک سخت افسوس ناک واقعہ ہے۔''

حالؔی کا طرزِ عمل اپنے ہم عصروں کے ساتھ انصاف پسندانہ اور فراخ دلانہ تھا۔ علاّمہ شبلی نعمانی سے چشمک کے باوجود وہ اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔ جب مولانا شبلی نعمانی نے طویل علالت کے بعد اُنہیں صحت یاب ہونے کی اطلاع دی تو وہ شبلی نعمانی کو ایک خط اس طرح لکھتے ہیں:

بنفسی ما بجاء البشیر وما اندی بشیٍ یسیر

(خوش خبری لانے والے کے پیامبر پر میری جان قربان ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس پیام کے بدلے ہدیۂ جان حقیر وارزاں ہے۔)

اس قدر مدّت کے بعد عنایت نامے کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کام کیا جو پیراہنِ یوسف نے چشمِ یعقوب سے کیا تھا۔ میری کوتاہ قلمی سے اگر آپ یہ سمجھے ہوں تو کچھ تعجب نہیں کہ مَیں آپ کے حقوقِ صحبت کو بھول گیا ہوں مگر مولانا یہ تغافل اسی قسم کا ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

تغافلے کہ کم از صد نگاہِ حسرت نیست

حالؔی کو کسی کی دل آزاری پسند نہیں تھی۔ کسی شاعر نے اُنہیں ایک قطعۂ تاریخ اصلاح کی غرض سے روانہ کیا۔ قطعہ ناقص تھا۔ اُنہوں نے اُسے درست کر دیا اور شاعر موصوف کو اس خوبی سے خط لکھا کہ وہ آزردہ نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ کے قطعۂ تاریخ میں تھوڑا سا تصرّف کر کے واپس بھیجتا ہوں۔ مجھ سے بھی اس تاریخ کے لئے کہا گیا ہے مگر اب دوسری تاریخ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ یہ مادۂ تاریخ بہت عمدہ ہے۔''

حالؔی ہر شخص کی خوبیوں کا اعتراف خوش دِلی سے کرتے تھے۔ وہ اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے خطوط بھی لکھتے تھے۔ عزیزؔ صفی پوری نے حالؔی کو اپنا کلامِ نثر روانہ کیا جسے پڑھ کر اُنہوں نے ایک خط تحریر کیا جس کی چند سطور اس طرح ہیں:

''اس زمانۂ ناپرسان میں جب کہ قدیم کمالات بسبب کساد بازاری کے صفحۂ روزگار سے مٹتے جاتے ہیں۔آپ جیسے صاحبِ کمال خاک دانِ ہند میں اب تک موجود ہیں اور جس متاع کا مُلک میں کوئی خریدار نہیں اُس کے آپ ہی مالک اور آپ ہی خریدار ہیں۔''

کان پور سے شائع ہونے والے رسالہ ''زمانہ'' کو حالؔی بہت پسند کرتے تھے۔اُنہوں نے اس رسالہ کے مدیر منشی دیا نرائن نگم کو لکھے گئے ایک خط میں اپنے تاثرات اس طرح رقم کیے ہیں:

''زمانہ'' کو مَیں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو مستثنیٰ رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اُردو لٹریچر کو ناشائستگی کے خس وخاشاک سے پاک کررہے ہیں۔''

حالؔی طالب علموں اور نئے لکھنے والوں کی عمدہ نگارشات کی تعریف دل کھول کر کرتے تھے اور اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے اُنہیں خطوط بھی لکھتے تھے۔رسالہ ''الندوہ'' میں ندوہ کے ایک طالبِ علم ضیاءالحسن علوی کے ایک مضمون کو پڑھ کر اُنہوں نے ایک خط کے ذریعہ اُس کی بہت تعریف کی تھی۔ایم.اے.او.کے کسی پرانے طالبِ علم نے حالؔی کے خلاف ایک مضمون لکھ کر شائع کرایا جس کے متعلّق وہ ایک خط میں اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں کہ:

''اس مضمون کی مَیں کچھ تعریف نہیں کرسکتا۔شکر ہے کہ اُردو زبان میں نئے لائق رائٹر پیدا ہوتے جاتے ہیں۔''

حالؔی کے بیش تَر خطوط سے واضح ہے کہ وہ جس قدر خلوص ومحبت اور اُنس وہم دردی کا پیکر تھے اُسی قدر انصاف پسند بھی تھے۔سیّد محمود کی بے اعتدالیوں سے متعلّق اُن کے ایک خط کی درج ذیل سطور اُن کی انصاف پسندی کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''سیّد محمود کی بے اعتدالیاں اب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور لوگوں کو اُن کی آڑ میں کالج کو درہم برہم کرنے کا خاصا موقع مل گیا ہے۔سیّد محمود کو پریسیڈینٹی سے علاحدہ کرنا نہایت ضروری ہے۔کاش ہز آنر کے برطرف کرنے کا مشورہ دیں۔''

حالؔی کے خطوط فراخ دلی، ہندو مسلم اتّحاد، قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کے بہترین نمونے ہیں۔اُن کے خطوط کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے پرائے، ہندو مسلم، سکھ عیسائی اور تمام ابنائے جنس کی بھلائی کے خواہاں تھے جیسا کہ اُن کے ایک خط کی درج ذیل تحریر سے بھی ظاہر ہے:

''مَیں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں سمجھتا کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو سلوک اور بھلائی کی جائے۔''

سرسیّد احمد خاں کے مذہبی نظریات سے حالؔی نہ تو پوری طرح متّفق تھے اور نہ پوری طرح مخالف۔خدا پرستی اور خدا ترسی اُن کا شعار تھا۔وہ مذہبِ اسلام کی حقّانیت کے دل وزبان سے قائل تھے۔اُنہیں کس طرح پتہ چلا کے اُن کا کوئی عزیز عیسائی مذہب کی طرف مائل ہو رہا ہے تو اُنہوں نے مذہبِ اسلام کی ترغیب دینے کے لئے اس کے نام ایک تفصیلی خط اس طرح لکھا:

''انگریزی تعلیم کی بے شک اس زمانے میں بہت ضرورت ہے مگر نہ ایسی کہ مذہب اور دین جیسی عزیز چیز کو اُس پر قربان کر دیا جائے.....کیوں شرافت اور سیادت کے نام کو دھبّا لگاتے ہو، کیوں اپنی زندگی کو تلخ کرتے ہو اور کیوں اپنی حماقت اور بے وقوفی تمام عالم پر ظاہر کرتے ہو؟''

حالؔی کے خطوط نہایت سلیس اور عام فہم ہیں جن میں کہیں کہیں شوخی وظرافت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حالؔی کے خطوط اُن کے مزاج وکردار اور اُن کی سیرت وشخصیت کا آئینہ ہیں۔

06.06 شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی نے بہت سے خطوط دیگر احباب کے علاوہ زہرا بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کے نام بھی لکھے ہیں جو کئی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔اُن کے خطوط کا طرزِ بیان نہایت سادہ، بے تکلّف اور دل چسپ ہے۔اُنہیں دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا عکّاس بھی کہا جا سکتا ہے۔ان خطوط میں مولانا کے وہ خیالات بھی در آئے ہیں جو اُن کی تصانیف میں نظر نہیں آتے۔زہرا بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کو لکھے گئے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شائستہ اور تعلیم یافتہ خواتین کی صحبت کا اثر قابل سے قابل مردوں پر کس حد تک پڑتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے خطوط میں عورتوں سے متعلّق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اُنہیں خواتین کے فیضِ صحبت کا نتیجہ ہیں۔مولانا نے اُن خیالات ونظریات کو کبھی عام نہیں کیا جو اُن کے خطوط میں عورتوں سے متعلّق جا بجا نظر آتے ہیں۔شاید اسی لئے ایک بار عطیہ بیگم فیضی نے اُنہیں کم ہمّت بھی کہا تھا جس کا جواز اُنہوں نے عطیہ بیگم فیضی کو تحریر کیے گئے ایک خط میں اس طرح پیش کیا ہے:

''تم کہتی ہو کہ مَیں بد ہمّت ہوں۔میری زندگی کے دو حصّہ ہیں، پرائیویٹ اور پبلک۔اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو تم میری ہمّت کا اندازہ کر سکتیں۔تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھ کو کیا مشکلات ہیں؟ تم کو کیا معلوم ہے کہ مَیں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔''

یہاں پبلک کے کام سے مُراد ندوہ کی ذمّہ داریاں ہیں۔شبلی نعمانی کے اس عذر یا جواز سے ظاہر ہے کہ اکثر مدبّرین اور مصلحین کو عوام کی مرضی کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔درج بالا خطوط کے اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ شائستہ اور تعلیم یافتہ خواتین کے اثرات سے مولانا شبلی اور اُن جیسے دیگر پختہ کار اور فاضل اشخاص بھی خود کو بچا نہیں سکتے۔علاّمہ شبلی نعمانی کے متعدّد خطوط عورتوں کے معاشی، سماجی، تعلیمی اور دیگر مسائل سے متعلّق ہیں۔وہ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''عورتوں کے متعلّق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو نہیں پسند کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کیے اس بل پر کیے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیے۔جمال اور حُسنِ نزاکت پر موقوف نہیں۔تنومندی، دلیری اور دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حُسن وجمال قائم رہ سکتا ہے۔مرد نما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔''

مولانا نے اپنے خطوط کے ذریعہ بار بار عطیہ بیگم فیضی کو موسیقی سیکھنے کا مشورہ بھی دیا ہے اور اُن کے گانا گانے کے طریقے کی تنقید بھی کی ہے جیسا کہ ایک خط کے درج ذیل اقتباس سے بھی ظاہر ہے:

''گانے کے ذکر پر ایک بات یاد آئی جو مدّتوں سے دل میں تھی مگر کہنے کی جرأت نہ تھی۔ مَیں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سُنے۔ تم کو خدا نے خوش آواز عطا کی ہے اور نہایت موثر آواز ہے لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں اس لئے تم بالکل بے سُرا گا رہی تھیں۔ موسیقی کی معلومات ضرور ہیں ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ بارہا تم سے گانا سُننے کو جی چاہا لیکن رُک گیا کہ تمہاری گٹکری اور تانیں بے قاعدہ تھیں۔''

درج بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ شبلی نعمانی کٹّر اور محدود خیال علما کی طرح تنگ نظر نہ تھے۔ وہ اچھّی طرح واقف تھے کہ وقت کے ساتھ چلنے اور ترقّی کرنے کے لئے عورتوں کو کن صفات اور خوبیوں کی ضرورت ہے۔ خواتین کے متعلّق اُن کے خیالات نہایت وسیع اور ہم دردانہ تھے۔ وہ بے پردگی کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ عطیہ بیگم فیضی کو مجمع عام میں پوری آزادی اور بے پردگی کے ساتھ تقریر کرنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں:

''آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے۔ صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجمع عام میں تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آچکی ہیں اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو۔''

مولانا کے خطوط محبت وخلوص کا بہترین نمونہ ہیں۔ خطوطِ شبلی کے علاوہ اُن کے رُقعات کی دو جلدیں بھی شائع ہو چکی ہے مگر عشق و محبت کے ولولے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں کا لطف اُن رقعات میں مفقود ہے۔ شبلی کے خطوط ایسے جواہر ریزے ہیں جو دوسرے خطوط نگاروں کے یہاں خال خال نظر آئیں گے۔ اُن کے خطوط نہ تو فرضی ہیں اور نہ بناوٹی اور نہ پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے۔ اُن کے خطوط میں ادبی نکات بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے ان خطوط میں اپنے کلام سے متعلّق بھی نہایت بے تکلّفی سے اظہار خیال کیا ہے جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے بھی ظاہر ہے:

''میرا چھوٹا سا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور مَیں نے برعکس نہند نام زنگی کافور'' ان کانٹوں کا نام دستۂ گُل رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں۔ اس لئے ان کا پردہ ہی میں رہنا مناسب ہے۔''

دراصل شبلی نعمانی کے خطوط بے ریائی اور خلوص کی سچّی تصاویر ہیں جو تصنع، تکلّف اور بناوٹ سے پاک وصاف ہیں۔ یہ دلی جذبات وخیالات کے ایسے نقوش ہیں جو بے ساختہ دل سے نکل کر زبانِ قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔

06.07 مہدی افادی

مہدی افادی کے خطوط رنگینی اور جمالیات کی وجہ سے نہایت دل چسپ اور پُر لطف ہیں۔ اُن کے خطوط میں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے خطوط میں کہیں ادیب و نقّاد کی حیثیت سے نظر آتے ہیں تو کہیں ناصح و مشفق کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیبِ مہدی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مہدی افادی کے متعدد خطوط سرکاری نوعیت کے ہیں جن میں وہ تحصیل دار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اس قسم کے خطوط میں افسران و ماتحت ملازموں کی بد دماغی، کیمپوں کی آرائش، مہمان داری، ملازمت سے متعلّق دیگر مسائل رقم کیے گئے ہیں۔

مہدی افادی کا حلقۂ احباب وسیع تھا جن میں سے کئی بہترین ادیب اور صاحبِ ذوق تھے۔ جن کے نام اُنہوں نے متعدد خطوط لکھے ہیں۔ وہ سنجیدہ مسائل و مباحث کو بھی خوب صورت الفاظ میں رقم کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ اکثر اپنے ثقہ دوستوں کو اُن کی مولویت پر چھیڑتے بھی رہتے تھے۔ شبلی نعمانی کو لکھتے ہیں کہ:

''مدّت کی تلاش کے بعد وہ جنسِ لطیف ہاتھ آئی جو آپ لوگوں کو دوسری دنیا میں ملے گی۔''

مہدی افادی الفاظ اور تراکیب کے اُلٹ پھیر سے اپنے خطوط کی عبارت کو نہ صرف پُر لطف بنا دیتے ہیں بلکہ نہایت معنی خیز اور بڑے پتہ کی بات بھی کہہ جاتے ہیں۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی کا عقد ثانی ہوا اور وہ نکاح کی پہلی ہی رات کو بیمار ہو گئے تو اُن کے متعلّق مہدی افادی لکھتے ہیں:

''جسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں شکن بستر نکلا۔''

اور پھر اُنہیں کو لکھتے ہیں:

''دو آتشہ اچھّی کھچی ہوئی ہو تو نشاطِ ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ مَیں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ اپنے ایک دوست کو ''نقّاد'' کے متعلّق اس طرح لکھتے ہیں:

''نقّاد میں مضامین کیا لکھوں کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا۔ اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ پہلے ایک خانگی بہم پہنچائی گئی تھی اب ڈنکے کی چوٹ ایک سرائے والی پیش کی گئی ہے یعنی زمانی کی جگہ ایک شگفتہ کلی نے لے لی۔ شاہ صاحب تصوّف کے دل دادہ لغزشِ مستانہ سہارا ڈھونڈتی ہے، موقع ملا اور پھیلے۔''

مہدی افادی کے خطوط کی اہمیت محض اس لئے نہیں ہے کہ وہ صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں۔ اُن کے خطوط میں ادبی مباحث، کتب و رسائل پر تنقیدیں اور تبصرے، اُدبا و شعرا کی نگارشات کی خوبیوں اور خامیوں پر بے باک اور دوٹوک آرا جا بجا نظر آتی ہیں۔ ''فلسفۂ غالبؔ'' کے عنوان سے مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ایک مضمون لکھا تھا جس کے متعلّق انہوں نے پروفیسر عبدالباری کو ایک خط لکھا جس کی چند سطور درج ذیل ہیں:

''جو رکھ رکھاؤ غالبؔ سے منسوب کیا جاتا ہے اُن میں اکثر نکات بعدالوقوع ہیں۔ مَیں نہیں کہتا کہ

حکیمانہ صداقتیں اُن کے کلام میں موجود نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس فلسفیانہ سانچے میں ہم اس کو ڈھالنا چاہتے ہیں کیا شاعر بھی ہر جگہ اسی نقطہ سے واقف تھا۔ اُس میں ذرا مجھ کو کلام ہے۔''

مہدی افادی کے خطوط میں اُن کی فطرت اپنے پورے جمال وشباب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے خیالات وجذبات کو حسین اور لطیف پیرایے میں اس طرح رقم کرتے ہیں کہ اُن کی فطرت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ اُن کے خطوط میں بالغ نظری کے ساتھ بلا کی شوخی، شرارت اور ظرافت بھی پائی جاتی ہے۔ اُن کے ذہن میں جو خیال آتا ہے اُسے وہ بڑی بے باکی سے اپنے خطوط کا حصّہ بنا دیتے ہیں۔ اُنہیں نئی تراکیب وضع کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ انگریزی اصطلاحات کے لئے نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ وہ اُردو کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کے خواہ مخواہ استعمال کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ پروفیسر عبدالباری ندوی کو لکھے گئے اُن کے ایک خط کی درج ذیل سطور سے بھی ظاہر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مبادیٰ کہ دیباچہ میں اسٹائل اور اسٹوڈینٹ کی پیوندکاری کس ضرورت سے ہے؟ آپ کی انگریزی دانی تو مسلّم الثبوت ہے۔ اچھّا! نظرِ بد کا اسپند ہوگا۔''

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مہدی افادی کے خطوط میں اُن کی سیرت وشخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ وہ بعض خطوط میں نہایت بے تکلّفی سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے خطوط میں ادبی مباحث، تبصرے اور تنقیدیں بھی ہیں اور موجودہ صورتِ حال کی عکّاسی بھی ہے۔ وہ خوش نما فقروں، اعلیٰ درجہ کے الفاظ اور خوش گوار طنز وظرافت کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کے بعض خطوط میں تکلّف، تصنّع اور کاوشوں کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض خطوط تو خطوط کی حدود سے بڑھ کر مضامین کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

06.08 ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے کئی مجموعہ شائع ہو چکے ہیں جن کے نام مکاتیبِ ابوالکلام آزاد، نقشِ آزاد، تبرکاتِ آزاد، کاروانِ خیال اور غبارِ خاطر قابلِ ذکر ہیں لیکن ان میں سے سب سے زیادہ شہرت ''غبارِ خاطر'' کو حاصل ہوئی۔ غبارِ خاطر ان کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء اسی کے دوران زمانۂ اسیری میں قلعۂ احمد نگر میں لکھے تھے۔ سخت پابندیوں کے سبب قلعۂ احمد نگر میں وہ نہ تو کسی سے مل سکتے تھے اور نہ کسی سے خط وکتابت کر سکتے تھے۔ تنہائی کے احساس کو کم کرنے اور اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے وہ اپنے ایک دوست نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام خطوط لکھتے رہے جو کبھی ڈاک کے حوالے نہیں کیے جا سکے۔ اُن کی رہائی کے بعد انہیں خطوط کے مجموعہ کو ''غبارِ خاطر'' کے نام سے شائع کر دیا گیا جس کے متعلّق وہ خود لکھتے ہیں کہ:

''مَیں جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سُن رہے ہوں یا نہ سُن رہے ہوں میرے ذوقِ مخاطبت کے لئے یہ خیال بس کرنا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے۔''

اُنہوں نے اپنے ایک خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوب کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح دل مستمند پر چھا گئیں کہ قلم اُٹھالیتا تو پھر رکنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا، کبھی بالِ کبوتر سے، میرے حصّے میں عنقا آیا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے موضوعات مختلف ہیں اور وہ حسبِ ضرورت مختلف اسالیب اختیار کرتے ہیں۔ اُنہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بعض خطوط کی زبان عام فہم اور سلیس ہے، بعض خطوط کی عبارت فارسی آمیز ہے تو بعض خطوط کی زبان پوری طرح علمی ہے۔ اُن کے یہاں شعریت کا بھی غلبہ ہے اور سنجیدگی و شوخی بھی نظر آتی ہے۔ اُن کے بعض خطوط طنز و ظرافت کے بہترین نمونے بھی ہیں۔

قلعۂ احمد نگر سے لکھے گئے بعض خطوط موسیقی، باغبانی، داستانِ بے ستون و کوہکن اور خوشی کا فلسفہ جیسے سنجیدہ موضوعات سے متعلّق ہیں تو بعض خطوط 'چڑیا چڑے کی کہانی' جیسے علامتی بھی ہیں اور بعض خطوط ہلکے پھلکے موضوعات سے بھی متعلّق ہیں جن میں سے بیش تر خطوط کا اندازِ تحریر مضمون اور انشائیہ جیسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نقّادانِ فن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مولانا کے یہ خطوط، خطوط نہ ہو کر مضامین اور انشائیے ہیں۔ اُنہیں خط کے زُمرے میں شامل کرنے کے لئے ہر خط کے شروع میں 'صدّیقِ مکرم' کا لقب لکھ دیا گیا ہے اور آخر میں مولانا نے اپنے دستخط کر دیے ہیں جن کے سبب ان مضامین اور انشائیوں نے خطوط کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مولانا کی خطوط نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ خطوط میں اپنی شخصیت کو نمایاں نہیں ہونے دیتے البتّہ بعض خطوط ایسے بھی ہیں جہاں اُن کی شخصیت سے تمام پردے ہٹ گئے ہیں۔

مولانا کی بیگم زلیخا سخت بیمار ہیں۔ اخبارات میں اُن کی علالت کی خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ مولانا کا صبر و سکون غارت ہو چکا ہے مگر وہ اپنے درد و کرب کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے جیسا کہ اُن کے ایک خط کی درج ذیل اقتباس سے بھی ظاہر ہے:

''میرے صوفے کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ اس لئے جب تک آدمی اندر آ کر کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ جب جیلر آتا تھا مَیں حسبِ معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا تھا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا، گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ ساری ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا ایک مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اُس کے دامنِ صبر و قرار پر بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبّا نہ لگ جائے۔''

مولانا کے ایک خط کی درج ذیل سطور سے اُن کے خاندان کی قدامت پرستی کا بھی پتہ چلتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میری تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تک گزر ہی نہ تھا۔''

مولانا چائے نوشی کے شوقین تھے۔ اُنہیں وہائٹ جیسمن (White Jasmine) نامی چینی چائے بہت پسند تھی جسے وہ 'گوری چنبیلی' کہتے تھے۔ وہ اس چائے میں شکر کے بجائے مصری کا استعمال کرتے تھے اور دودھ بالکل نہیں ڈالتے تھے۔ ایک مرتبہ جب اُنہیں یہ چائے میسر نہیں ہوئی تو وہ اس کیفیت کو ایک خط میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''مجبوراً ہندوستان کی اُسی سیاہ پتّی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اُس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں۔''

مولانا کے خطوط کے ذریعہ اُن کی شخصیت کے بے شمار ان دیکھے پہلوؤں کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔آخر میں اُن کے خطوط سے ماخوذ چند مختصر اقتباسات اس لئے درج ہیں کہ اُن کے اسلوب اور خطوط نگاری کی خصوصیات کو اور بھی اچھّی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

☆زندگی کے بازار میں جنسِ مقاصد کی بہت سی جستجوئیں کی تھیں لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈ رہا ہوں۔

☆کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم پھولوں کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں اور ہر چبھن میں راحت وسرور کی ایک دولت پاتے ہیں۔

☆میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی۔

☆اس کارخانۂ ہزار شیوہ رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تاکہ کھولے جائیں۔

☆جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں ہر شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حُسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح وشام چہکیں، اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش ومسرّت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے۔

06.09 رشید احمد صدّیقی

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کے خطوط اُن کے مذاقِ خاص کی واضح غمّازی کرتے ہیں۔اُنہیں میں سے ایک شخصیت کا نام رشید احمد صدّیقی ہے۔رشید احمد صدّیقی کے خطوط میں ایک خاص قسم کی دل کشی اور ادبیت پائی جاتی ہے۔اُن کے بعض خطوط میں طنز بھی ہے اور ظرافت بھی۔بعض خطوط میں چھیڑ چھاڑ اور چھینٹا کشی بھی نظر آتی ہے اور بعض خطوط ادبی شعور کا آئینہ دار ہیں۔اُن کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیبِ رشید احمد صدّیقی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

رشید احمد صدّیقی کے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے یہاں پُر تکلّف اور مصنوعی سنجیدگی نہیں ہے۔وہ لیڈر یا قائد نہیں بلکہ اچھّے رفیق اور مشفق انسان ہیں۔وہ سماجی ناہمواریوں اور زندگی کی اونچ نیچ پر ہنستے بھی ہیں، لوگوں کو ہنساتے بھی ہیں اور اپنی لغزشوں پر بھی دل کھول کر ہنستے ہیں۔اُن کے یہاں دیگر طنز نگاروں کی طرح زخموں کی بہار نہیں بلکہ لالہ وگُل کا چمنستان نظر آتا ہے۔

''مکاتیبِ رشید احمد صدّیقی'' کے بیش تر خطوط اُن کے آخری دَور کے ہیں جو اُن کی قلبی اور ذہنی کیفیات کے بہترین ترجمان بھی ہیں۔ان خطوط کے ذریعہ اُن کے زمانہ کی ادبی کاوشوں کے پس منظر کو بھی اچھّی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔رشید احمد صدّیقی ایک مرتبہ ایک عرصہ تک عزلت گزیں ہو گئے تھے۔بعض حضرات کو اُن کی کم آمیزی ناگوار خاطر ہوتی تھی اور بعض حضرات تو اسے تکبّر پر بھی محمول کرتے تھے۔دراصل وہ بعض حالات اور اپنی صحت کی وجہ سے عزلت گزیں تھے۔عمر کے آخری دَور میں اُن کے احساس کی شدّت بہت بڑھ گئی تھی۔وہ ہر

اُس صورتِ حال سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے جو اُنہیں دل برداشتہ کردے۔اس کے باوجود وہ لوگوں کے مسائل اور دیگر صورتِ حال سے کبھی بے خبر نہیں ہوئے۔وہ حاجت مندوں کی فراغ دِلی سے حاجت روائی کرتے تھے۔یہی نہیں بلکہ وہ اُس وقت تک بے چین رہتے تھے جب تک اُس کی مدد نہ کردیتے یا اُلجھے ہوئے مسئلہ کو حل نہ کرلیتے۔وہ دوسروں کے دردوغم کو اپنا دردوغم سمجھتے تھے اور بار بار اُن کے متعلّق غور وفکر کرتے تھے۔اس طرح کے حالات ومسائل سے متعلّق اُن کے خطوط میں یاس وحسرت کے عناصر نظر آتے ہیں جیسا کہ ایک خط کے درج ذیل مختصر اقتباس سے بھی ظاہر ہے:

''ایسے Cases آجاتے ہیں تو اُن سے زیادہ مَیں بے قرار ہوتا ہوں۔کاش خدا نے اس قابل کیا ہوتا کہ پچاس فی صدی کی کچھ نہ کچھ مدد کرسکتا، ورنہ کراسکتا۔''

درج بالا خط کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ رشید احمد صدّیقی دوسروں کی مدد کے لئے کس قدر بے چین و بے قرار رہتے تھے۔یہ بے چینی اور بے قراری اُن کی سیرت کا ایسا پہلو ہے جو اُن کی کم آمیزی کے باعث عام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہا۔جو لوگ اُن کے مزاج سے پوری طرح واقف تھے یا جن لوگوں نے اُن کے خطوط کا مطالعہ کیا ہے وہ اُن کی دل نوازی اور ہم دردی کو بخوبی محسوس کرسکتے ہیں۔

رشید احمد صدّیقی کے خطوط کے طرزِ تحریر کی اہم خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو انتہائی موثر انداز میں ادا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔وہ بعض اوقات الفاظ کے اُلٹ پھیر سے تحریر میں ایسی خوبی نمایاں کردیتے ہیں جس کو ''الفاظ کا جادو'' قرار دیا جاسکتا ہے۔اُن کے اقوال کی حیثیت اشعار کی سی ہوتی ہے کہ سُنتے یا پڑھتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں۔

رشید احمد صدّیقی کے خطوط کا رلائل کے اس قول کے عکّاس ہیں کہ ''اچھّے ادیب کا طرزِ تحریر اُس کا لباس نہیں بلکہ جلد یا کھال ہے۔مصنف کتنے ہی پردوں میں چھپ جائے لیکن اُس کی انفرادیت پکار اُٹھتی ہے''۔یہی حال رشید احمد صدّیقی کا ہے، اُن کے خطوط کی تحریروں میں اُن کی شخصیت وانفرادیت کا نقش ثبت ہے۔

رشید احمد صدّیقی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ضیاء الدّین کو پسند نہیں کرتے تھے۔اُنہوں نے طنز ومزاح کے پیرایے میں اُن پر کئی بار وار بھی کیے تھے۔اس کے باوجود وہ اُن کی خدمات کا بھی دل کھول کر اعتراف کرتے تھے۔وہ ۲۰/جولائی ۱۹۷۰ء کے ایک خط میں خلیق احمد نظامی کو لکھتے ہیں کہ:

''کبھی اس پر بھی غور کیجیے گا کہ چھوٹے بڑے روزگار اور ملازمتوں سے مسلمانوں کو لگا دینے کی جو خدمت ڈاکٹر ضیاء الدّین نے مسلسل چالیس سال تک ہر طرح کی، ہمہ وقت رسوائی جھیل کر انجام دیں۔اُس کا ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت بنا دینے میں کیا حصّہ رہا ہے۔کیا آپ کی نظر سے ایسا کوئی اور شخص موجودہ صدی میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے۔۱۸۵۷ء کے آشوب کے بعد مسلمانوں کی آبادکاری میں سرسیّد کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدّین ہی کا درجہ آتا ہے۔''

کچھ عرصہ کے بعد رشید احمد صدّیقی نے پروفیسر ضیاء الدّین کے کارناموں سے متعلّق ایک مضمون قلم بند کیا۔جب خلیق احمد نظامی نے اس مضمون کی تعریف کی تو رشید احمد صدّیقی نے اُنہیں ایک خط لکھا جس کی چند سطور درج ذیل ہیں:

''مغفرت آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی ہو جاتی ہے۔ آپ نے جس طرح فکر ونظر والے مضمون کو پسند فرمایا اُس سے ڈاکٹر ضیاء الدّین صاحب کی آخرت ہی میں نہیں، میری بھی اس دنیا میں مغفرت ہوگئی۔ خدا آپ کو خوش رکھّے۔''

رشید احمد صدّیقی کے بیش تر خطوط اُن کے کردار کی بلندی کا ثبوت ہیں۔ اُن کے خطوط سے اُن کی روزمرّہ کی زندگی اور ادبی صورتِ حال کا بھی پتہ چلتا ہے۔ آخر میں بطورِ مثال اُن کا ایک خط درج ذیل ہے جو اُنہوں نے ۱۶/دسمبر ۱۹۷۰ء کو خلیق احمد نظامی کے نام تحریر کیا تھا:

''پروفیسر فاروقی نے رسم خط پر دہلی یونی ورسٹی میں مذاکرہ منعقد کرنے کا اہتمام کیا تھا جو شاید ملتوی ہو گیا۔ طبع آزمائی کے لئے مجھے بھی دعوت دی تھی۔ نتیجہ میں منسلکہ ٹائپ شدہ اوراق ہیں۔ ملاحظہ فرما کر واپس فرما دیجیے گا۔ آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

حسبِ اندیشہ.....کے والد کا.....خط آنے لگا ہے۔ اس بارے میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ معلوم نہیں آپ کے جاں نشین کیا سلوک کریں گے۔

جنرل ایجوکیشن کو آپ نے جو نئی زندگی دی ہے اُس کا چرچا عام ہے۔ مبارک ہو۔''

06.10 خلاصہ

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، سرسیّد احمد خاں، خواجہ الطاف حُسین حالیؔ، شبلی نعمانی، مہدی افادی، ابوالکلام آزادؔ، رشید احمد صدّیقی کا شمار اُردو کے اہم اور منفرد خطوط نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ غالبؔ نے عام روش سے ہٹ کر مراسلت کے اُن تمام قاعدوں سے انحراف کیا جو محمد شاہ کے وقت تک رائج تھے۔ اُن کے خطوط پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو آدمی قریب بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی خطوط نگاری کے متعلّق خود لکھا ہے کہ ''مَیں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔'' اُن کے خطوط سرگزشتِ حیات بھی ہیں اور بے تکلّفی وشوخی وظرافت کے بہترین نمونے بھی ہیں۔

سرسیّد احمد خاں کے بیش تر خطوط اُن کے نظریات کے حامل ہیں۔ اُنہوں نے متعدد خطوط کے ذریعہ مذہبِ اسلام کو عقل اور فطرت کا مذہب ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اُن کے خطوط میں وہی شخصیت جھلکتی ہے جو اُن کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں نظر آتی ہے۔ خواجہ الطاف حُسین حالیؔ کے خطوط نہایت مفید، کارآمد اور بصیرت افزا ہیں۔ اُن کے بیش تر خطوط ذاتی ہیں اور اُن میں بے تکلّف اور سنجیدہ شخصیت کی پوری طرح جلوہ گری ہے۔ شبلی نعمانی کے خطوط کا طرزِ بیان نہایت سادہ، بے تکلّف اور دل چسپ ہے۔ اُنہوں نے زہرا بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کے نام بھی خطوط لکھے ہیں جو کئی لحاظ سے اہم ہیں۔ اُن کے خطوط محبت وخلوص کا بہترین نمونہ ہیں۔ مہدی افادی کے خطوط رنگینی اور جمالیات کی وجہ سے نہایت دل چسپ اور پُر لطف ہیں۔ اُن کے خطوط میں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے خطوط میں کہیں ادیب ونقّاد کی حیثیت سے نظر آتے ہیں تو کہیں ناصح ومشفق کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خوش نما فقروں، اعلیٰ درجہ کے الفاظ اور خوش گوار طنز وظرافت کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے سب سے زیادہ شہرت ''غبارِ خاطر'' کو حاصل ہوئی۔ غبارِ خاطر اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اسیری کے دوران قلعہ احمد نگر سے اپنے دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط کبھی ڈاک کے حوالے نہیں کیے جا سکے۔ مولانا حسبِ ضرورت اور بہ اعتبارِ موضوع مختلف اسالیب اختیار کرتے ہیں۔ اُنہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بعض خطوط کی زبان عام فہم اور سلیس ہے، بعض خطوط کی عبارت فارسی آمیز ہے تو بعض خطوط کی زبان پوری طرح علمی ہے۔ اُن کے یہاں شعریت کا بھی غلبہ ہے اور سنجیدگی و شوخی بھی نظر آتی ہے۔ اُن کے بعض خطوط طنز و ظرافت کے بہترین نمونے ہیں۔ رشید احمد صدّیقی کے بیش تر خطوط اُن کی قلبی اور ذہنی کیفیات کے ترجمان اور اُن کی روزمرّہ کی زندگی کا آئینہ دار بھی ہیں۔ ان کے خطوط کے ذریعہ اُن کے زمانہ کی ادبی کاوشوں کے پس منظر کو بھی اچھّی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اُن کے بعض خطوط طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔

06.11 فرہنگ

آرٹیکل	: مضمون، Article	رائٹر	: مصنّف، تصنیف کرنے والا، کتاب لکھنے والا
آں حضرت	: وہ بزرگ، تعظیماً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نام کی جگہ بولتے ہیں	رتبہ پانا	: عزّت حاصل کرنا، مرتبہ پانا
		صلعم	: صلی اللہ علیہ وسلم کا مخفّف
اُٹھ جانا	: فوت ہوجانا، مرجانا	ظاہرداری	: نمائش، دکھاوا
اجیرن ہوجانا	: پریشان ہوجانا، عاجز ہونا	عجیب وغریب	: نادر، انوکھی، نرالی
اسپند	: کالا دانہ، ایک قسم کا تخم جسے دفعِ نظرِ بد کے لئے جلایا جاتا ہے	عنایت نامہ	: مہربانی کا خط
		فی الفور	: فوراً، جلدی، شتابی
اعتراف کرنا	: قبول کرنا، تسلیم کرنا	قبلۂ من	: میرا قبلہ، اپنے سے بُزرگ کو مخاطب کرتے وقت تعظیماً کہتے ہیں
اِقامت جاودانی	: ہمیشہ کا قیام، مستقل مسکن		
باب	: حصّہ، فصل، کتاب کا حصّہ	قحط الرّجال	: لوگوں کا کم پایا جانا، شرفا کی تعداد کم ہوجانا
بچانا	: حمایت کرنا، طرف داری کرنا	قدامت پرستی	: قدیم رسم ورواج کی تقلید، پُرانی باتوں کو پسند کرنا
پارٹ	: حصّہ، Part		
پیوندکاری	: پیوند لگانا، جوڑ لگانا	قدرکرنا	: عزّت کرنا، توقیر کرنا
پھولوں کی سیج	: پھولوں کا بستر، بسترِ گُل، نہایت آرام دہ بستر	قلم اُٹھالینا	: لکھنا شروع کردینا، بے ساختہ لکھنے لگنا
تاریخ	: وہ جملہ، شعر، مصرع یا فقرہ جس کے حروف کے عدد سے مادۂ تاریخ برآمد ہوجائے	کریلا اور نیم چڑھا	: تلخی میں اضافہ ہونے کے محل پر کہتے ہیں یعنی پہلے تو تلخ تھا ہی اب اور تلخ ہوگیا
تصرّف کرنا	: تبدیل کرنا، تحریف کرنا	کش لگانا	: حقّہ کا دَم لگانا

جانِ من : میری جان، کسی عزیز یا محبوب شخص کو مخاطب کرتے وقت یہ جملہ کہتے ہیں

جواب دینا : الزام کی تردید کرنا، کسی غلط بات کی دلیل کے ساتھ تردید کرنا

جوشاندہ : جوش دے کر تیّار کیا ہوا ایک قِسم کا مرکّب، کاڑھا

جی گھبرانا : دل پریشان ہونا، وحشت ہونا

جیلر : قید خانہ کا بڑا افسر، جیل کا داروغہ، داروغۂ زندان

حلال کی ہوئی : شریعت کے مطابق ذبح کی ہوئی

خس وخاشاک : خار وخس، کوڑا کرکٹ

دکھاوا : ظاہرداری، نمائش

دل اُٹکنا : بے چین ہونا، دل کا گھبرانا

دل سوزی : غم خواری، ہم دردی

دل کو جلانا : سخت رنج دینا، نہایت صدمہ پہنچانا

دَم نکلنا : جان نکلنا، مرجانا، فوت ہوجانا

دوآتشہ : وہ شراب جو دو دفعہ آگ پر رکھ کر کشید کی گئی ہو۔ تیز وتند شراب

دھبّا لگنا : داغ لگنا، بدنام ہونا، حرف آنا

ڈنکے کی چوٹ : اعلانیہ، علی الاعلان، کھُلّم کھُلاّ

کلام ہونا : اعتراض ہونا

کہاں تک : کس حد تک، کب تک

گزر : باریابی، رسائی، پہنچ

لاگت : کُل خرچ، اصل خرچ

مادۂ تاریخ : کسی جملہ، فقرہ، مصرع یا شعر کے حروف سے برآمد کی ہوئی تاریخ

مرگ ناگہاں : اتّفاقی مَوت، مَوت کا اچانک آنا، ناگہانی مَوت

مسلّم الثبوت : جس کو ثبوت کی ضرورت نہ ہو، مانا ہوا، تسلیم کیا ہوا

مِل بیٹھنا : باہم ملاقات کرنا، ربط وضبط ہونا

مِیل : ڈاک، Mail

نامہ بری : خط یا پیام لے جانے کا کام

نُسخہ : کتاب

نظرِ بد : بُری نظر

نیچر : فطرت، Nature

نیک بخت : خوش نصیب، اقبال مند

وہابی : شیخ عبدالوہاب کے فرقہ سے تعلّق رکھنے والا

ہنس بول لینا : ہنسی خوشی سے بات کرلینا

06.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ سرسیّد احمد خاں کی خطوط نگاری کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ شبلی نعمانی کے خطوط کے اہم موضوعات کو مختصراً تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ الطاف حُسین حالؔی کی خطوط کی بنیادی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ شبلی نعمانی کی خطوط نگاری کا تجزیہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ شبلی نعمانی کے خطوط کے اہم موضوعات کیا ہیں؟ قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۳ خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی خطوط نگاری کی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : درج ذیل میں سے کون سی تصنیف مولانا ابوالکلام آزادؔ کے خطوط کا مجموعہ نہیں ہے؟

(الف) تبرّکاتِ آزادؔ (ب) مقالاتِ آزادؔ (ج) نقشِ آزادؔ (د) مکاتیبِ ابوالکلام آزادؔ

سوال نمبر۲ : سرسیّد احمد خاں نے درج ذیل میں سے کس کے نام متعدد خطوط لکھے ہیں؟

(الف) میر مہدی مجروحؔ (ب) رتن ناتھ سرشار (ج) حسرت موہانی (د) نواب محسن الملک

سوال نمبر۳ : 'مکاتبِ حالؔی' کیا ہے؟

(الف) سوانح عمری (ب) ناول (ج) خطوط کا مجموعہ (د) سفرنامہ

سوال نمبر۴ : ''جسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں شکن بستر نکلا۔'' یہ عبارت کس کے خط سے ماخوذ ہے؟

(الف) مہدی افادی (ب) سرسید احمد خاں (ج) الطاف حُسین حالؔی (د) ابوالکلام آزادؔ

سوال نمبر۵ : اُردو میں خط لکھنے سے پہلے مرزا غالبؔ کس زبان میں خط لکھتے تھے؟

(الف) تُرکی (ب) ہندی (ج) عربی (د) فارسی

سوال نمبر۶ : ''غبارِ خاطر'' کیا ہے؟

(الف) افسانوں کا مجموعہ (ب) خطوط کا مجموعہ (ج) غزلوں کا مجموعہ (د) نظموں کا مجموعہ

سوال نمبر۷ : نواب محسن الملک کے نام کس خطوط نگار نے خطوط لکھے ہیں؟

(الف) ابوالکلام آزادؔ (ب) سرسید احمد خاں (ج) مہدی افادی (د) رشید احمد صدیقی

سوال نمبر۸ : کس خطوط نگار نے زہرا بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کے نام خطوط لکھے ہیں؟

(الف) شبلی نعمانی (ب) الطاف حُسین حالؔی (ج) سرسیّد احمد خاں (د) مہدی افادی

سوال نمبر۹ : سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب کس نے لکھا تھا؟

(الف) سرسیّد احمد خاں (ب) شبلی نعمانی (ج) نواب محسن الملک (د) ابوالکلام آزادؔ

سوال نمبر۱۰ : ''مَیں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے'' یہ جملہ کس خطوط نگار کے خط سے ماخوذ ہے؟

(الف) غلام غوث بےخبرؔ (ب) رجب علی بیگ سرورؔ (ج) مولوی عبدالحق (د) مرزا غالبؔ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ب) مقالاتِ آزاد	جواب نمبر۶	: (ب) خطوط کا مجموعہ
جواب نمبر۲	: (د) نواب محسن الملک	جواب نمبر۷	: (ب) سرسید احمد خاں
جواب نمبر۳	: (ج) خطوط کا مجموعہ	جواب نمبر۸	: (الف) شبلی نعمانی
جواب نمبر۴	: (الف) مہدی افادی	جواب نمبر۹	: (الف) سرسیّد احمد خاں
جواب نمبر۵	: (د) فارسی	جواب نمبر۱۰	: (د) مرزا غالبؔ

06.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو نثر کا فنّی اِرتقا	از	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۲۔ خطوطِ سرسیّد	از	سیّد راس مسعود
۳۔ خطوطِ شبلی	از	محمد امین زبیری
۴۔ غالبؔ شاعر و مکتوب نگار	از	پروفیسر نورالحسن نقوی
۵۔ مکاتبِ مہدی	از	مہدی افادی
۶۔ مکاتیبِ رشید احمد صدّیقی	از	خلیق احمد نظامی

اکائی 07 طنز و مزاح کا فن

ساخت

07.01 : اغراض و مقاصد
07.02 : تمہید
07.03 : طنز کی تعریف
07.04 : طنز کی اقسام
07.05 : مزاح کی تعریف
07.06 : مزاح کی اقسام
07.07 : طنز و مزاح میں فرق
07.08 : طنز و مزاح کی روایت
07.09 : چند طنزیہ و مزاحیہ اقتباسات
07.10 : خلاصہ
07.11 : فرہنگ
07.12 : سوالات
07.13 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض و مقاصد

زبان جس قدر ترقّی کرتی ہے اُس کے بولنے والوں کی ذہنی سطح بھی اُسی قدر بُلند ہوتی ہے اور اُس زبان کا طنزیہ و مزاحیہ ادب بھی اُسی قدر فکر انگیز اور بالیدہ ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی زبان میں طنز و مزاح کا ادبی سرمایہ اُس زبان کی تہذیبی اور فکری رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ طنز و مزاح زمانے کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے اور اصلاح کرنے کے نہایت کارگر وسائل ہیں۔ جوں جوں زمانہ ترقّی کر رہا ہے، فکاہی ادب کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ طنز سے چھٹپٹانے اور مزاح سے لطف اندوز ہونے والوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اس لئے اُردو کے ہر طالبِ علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ طنز و مزاح کے فن کا نہایت سنجیدگی سے مطالعہ کرے اور فنِ طنز و مزاح سے پوری طرح واقف ہو۔ اسی اغراض و مقاصد کے تحت اس اکائی میں ''طنز و مزاح کا فن'' کے عنوان سے طنز و مزاح کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مطالعہ کی سہولت کے پیشِ نظر اس اکائی کو طنز کی تعریف، طنز کی اقسام، مزاح کی تعریف، مزاح کی اقسام، طنز و مزاح میں فرق، طنز و مزاح کی روایت اور چند طنزیہ و مزاحیہ اقتباسات کے ذیلی عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے۔ اگر آپ اس اکائی کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں گے تو آپ نہ صرف طنز و مزاح کے فن سے واقف ہو جائیں گے بلکہ طنز و مزاح کے تئیں آپ کی دل چسپی میں بھی اضافہ ہوگا۔

07.02 تمہید

اکثر ایک ساتھ بولے اور لکھے جانے کے سبب طنز و مزاح کو ایک ہی چیز سمجھ لیا جاتا ہے جب کہ دونوں کے مفہوم اور دائرۂ کار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ طنز اور مزاح میں گہرا تعلّق بھی ہے۔ طنز کے ذریعہ سماج کی ناہم وَاریوں اور انسان کی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے ضرب لگائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا شائستہ اور ادبی ہتھیار ہے جس کے ذریعہ طنز نگار سماج کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ مزاح کے معنی خوش طبعی کے ہیں۔ اُردو میں یہ لفظ ظرافت، خوش مذاقی، بذلہ سنجی وغیرہ کے لئے مروّج ہے۔ خوش طبعی انسان کی حسین و تعمیری صفت ہے۔ کبھی کبھی یہی صفت بڑھتے بڑھتے پست مذاق، ٹھٹول اور پھکّڑ پن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لطیف مزاح انسانی زندگی میں خوشی و مسرّت اور انبساطی کیفیت پیدا کر کے انسانی فکر کو متحرّک کرتا ہے۔ خالص مزاح زندگی سے والہانہ اُنس کا نتیجہ ہے۔ اس کے ذریعہ غیر محسوس طور پر خیالات اور زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

07.03 طنز کی تعریف

طنز کو انگریزی میں سیٹائر (Satire) کہتے ہیں جو لاطینی زبان کے لفظ سیٹورا (Satura) سے ماخوذ ہے۔ اس کا مقصد تلقینِ حقیقت ہوتا ہے۔ حقیقت اور بالخصوص تلخ حقیقت کو ایسے ادبی پیرایے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جس سے سماج یا انسان کی غیر شعوری طور پر اصلاح کی جا سکے۔ طنز افراد کی ناگوار حرکات، اعمال اور ماحول و معاشرے سے بے اطمینانی کی وجہ سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ طنز نگار افراد کی خامیوں اور ناپسندیدہ اشیاء کی تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے لیکن وہ اپنی ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار براہِ راست نہیں کرتا بلکہ ایسے جملوں کی مدد لیتا ہے جو تلخی کے باوجود لطافت کا بھی احساس کراتے ہیں۔ ناقدین اور دانش وَروں نے اپنے اپنے طور پر طنز سے متعلّق خیالات کا اظہار کیا ہے اور طنز کی تعریفیں کی ہیں جن کی روشنی میں طنز کے فن کو اچھّی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

طنز کی خصوصیت کے متعلّق ولیم ہیزلٹ نے لکھا ہے کہ:

> ''زندگی کی تضاد اُس کی زیادتیاں اور بے انصافیاں ہم کو صرف آنسو نہیں بلکہ زہرِ خند بھی عطا کرتی ہیں۔ طنز نگار کی آنکھیں بڑے ضبط اور وقار سے آنسوؤں کو حلقۂ چشم میں چھپا کر مسکراتی ہیں۔''

طنز کے بارے میں جیمس سدرلینڈ رقم طراز ہیں:

> ''طنز نگار کُرسیِ انصاف پر متمکن منصف کی طرح ہوتا ہے جو مہذّب سماج کے قاعدے قانون کی دیکھ بھال اور مردوں اور عورتوں کی جانچ پڑتال، اخلاقی، دماغی، معاشرتی، دیگر معیاروں کے مطابق کرتا ہے۔''

وزیر آغا کے مطابق:

> ''طنز بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حسّاس اور درمند انسان کے ذہنی ردِّ عمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کی ناہم وَاریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنا لیا ہو۔''

رشید احمد صدّیقی نے طنز (ہجا) کی تعریف اس طرح کی ہے:

''ہجا کا عام مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شخص، شے یا واقعہ کی برائی پیش کی جائے خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز، صحیح ہو یا غلط۔ اس کی مختلف نوعیتیں ہیں اور اس میں طعن و طنز، ہنسی ٹھٹھول، نوک جھونک، پھکّڑ پن اور مغلّظات سب آجاتے ہیں۔''

رشید احمد صدّیقی نے طنز کے دائرہِ کار کا تعیّن بھی کیا ہے جو مندرج ہے:

''بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد اور تعصّب سے پاک ہو اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔''

ڈاکٹر ظہیر احمد صدّیقی نے طنز کی تعریف اس طرح کی ہے:

''سیٹائر (Satire) کے لئے اُردو میں طنز، ہجو، تعریض، لعن طعن اور مذمّت وغیرہ الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے مگر طنز لفظ کا استعمال اُسی سیٹائر کے لئے کیا گیا ہے جس کا مقصد کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبۂ تفریح کو تحریک ہو۔ بشرطیکہ اُس میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اُسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو۔ اگر ان حیثیتوں کا فقدان ہوا تو پھر یہ محض گالی گلوچ یا دہقانیوں کی طرح مُنہ چڑانا ہوگا۔''

کلیم الدّین احمد طنز کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''ہجو میں ذاتی عنصر کا وجود ناگزیر ہے۔ اساسی شرط یہ ہے کہ شاعر اپنے جذبے کو عالم گیری عطا کر سکے یعنی وہ اپنی شخصیت کو علاحدہ کر کے اپنے جذبۂ نفرت و غضب کو عام انسانی نقائص کے خلاف برانگیختہ کر سکے۔ بہترین طنز کی شرط یہ ہے کہ ذاتی جذبہ محض ذاتی نہ رہے بلکہ عالَم گیری ہو جائے۔''

ڈاکٹر شوکت سبزواری طنز کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''طنز ظرافت سے بالکل الگ چیز ہے۔ یہ ایک طرح کی تنقید، ایک قسم کا عملِ جرّاحی ہے۔ طنز میں چیز کے بُرے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ طنز میں شدّت اور تیزی ضروری شے ہے۔ یہ اچھّے اور بڑے مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ ادب میں طنز کی اہمیت مقصدیت کی وجہ سے ہے۔ یہی مقصدیت ہے جس کی وجہ سے طنز کی تلخی گوارہ کر لی جاتی ہے۔''

ڈاکٹر شانتا رانی نے طنز کی تعریف اس طرح کی ہے:

''طنز کسی ادارہ، سماج، فرد یا کسی گروہ کی کمزوریوں اور برائیوں کو منظرِ عام پر لا کر اُن پر وار کرتا ہے۔''

مندرجہ بالا طنز کی تمام تعریفوں کی روشنی میں طنز کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے:

طنز کسی طنز نگار کے جذبہ اور ماحول کا عکس ہوتا ہے جس میں فرد یا سماج کی کمزوریوں اور ناہم وَاریوں کو درست کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس کا مقصد محض تلخ کلامی اور تیکھا وار نہیں بلکہ ادبی اور مزاحیہ انداز بھی ہے۔

07.04 طنز کی اقسام

طنز کا مقصد تلقینِ حیات ہے۔ تلقین کو ایسے ادبی پیرایے میں ادا کیا جاتا ہے کہ جس سے سماج اور انسان کی غیر شعوری طور پر اصلاح ہو سکے۔ طنز کی مختلف اقسام ہیں جن میں سے درج ذیل کا ذکر مختصراً کیا جا رہا ہے:

﴿۱﴾ **استہزا:**۔ چبھتے ہوئے فقروں سے کسی کی تضحیک و تذلیل کرنے کو استہزا کہتے ہیں۔ اس قسم کے طنز میں دلائل سے اصلاح نہ ہونے پر خردمندانہ وار کیے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد کسی کی دل آزادی کرنا اور چوٹ پہنچانا ہوتا ہے جیسے انشاءاللہ خاں انشؔا نے شیخ پر اس طرح طنز کیا ہے۔

آئینہ کی گر سَیر کرے شیخ یہ دیکھے سَر خِرس کا، مُنہ خوک کا، لنگور کی گردن

﴿۲﴾ **رمز و کنایہ:**۔ رمز و کنایہ کے ذریعہ کیے جانے والے طنز میں عام طور پر ذاتی بغض و عناد کا دخل نہیں ہوتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ کدورت ضرور ہوتی ہے اور بذلہ سنجی کی آڑ میں اصل بات کو چھپا کر وار کیا جاتا ہے۔ اسے نوک جھونک بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں نوک جھونک کے لئے آئیرنی (Irony) کی اصطلاح رائج ہے۔ اشارے اشارے میں ایسی بات کہی جاتی ہے جسے متعلقہ شخص یا اشخاص تو سمجھ لیتے ہیں لیکن دیگر افراد کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ کبھی دلائل، نظریات اور طریقۂ استدلال کو بظاہر تسلیم کر کے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کے کمزور پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں اور کبھی مبالغہ آمیز ایسی بات کہی جاتی ہے جس سے تمام باتیں رَد ہو جاتی ہیں جیسے غالبؔ کا یہ شعر۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اِتراتا وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

﴿۳﴾ **ضلع جگت:**۔ کسی کو مبحث قرار دے کر جو باتیں کہی جائیں وہ ضلع یعنی تلازمۂ کلام کے زُمرے میں آتی ہیں۔ جگت کے معنی دانائی یا عقل مندی کے ہیں۔ اس لئے رعایتِ لفظی سے کام لے کر کوئی پہلو دار یا ذو معنی بات اس طرح کہنا کہ قاری لفظ کے دونوں معانی کی طرف متوجّہ ہو جائے اور اُسے طنز کا احساس بھی ہو تو اُسے ضلع جُگت کہتے ہیں جیسے جانؔ صاحب کا یہ شعر ضلع جگت کا بہترین نمونہ ہے۔

آرزو بندی کی خالق سے ہے اک دن میری سَوت کھائے پھل تلوار کا اور پھول سونگھے ڈھال کا

﴿۴﴾ **رعایتِ لفظی:**۔ رعایتِ لفظی کو انگریزی میں پَن (Pun) کہتے ہیں۔ بہ اعتبارِ معنی بالکل مختلف اور بہ اعتبارِ تلفّظ یکساں اور مشابہ الفاظ کے استعمال سے طنز پیدا کرنے کو رعایتِ لفظی کہتے ہیں۔ ایسے الفاظ کے اُلٹ پھیر اور ذو معنویت کے ذریعہ مزاح کے پیرایے میں طنز کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل شعر سے ظاہر ہے۔

ہمارے ہاتھ کی پہنچی، سجن جو آپ نے بھیجی اگر پہنچی، وہ پہنچی کیا جو پہنچے تک نہیں پہنچی

﴿۵﴾ **تحریف:**۔ تحریف کو انگریزی میں پیروڈی (Parody) کہتے ہیں۔ کسی نگارشات کے الفاظ اور مصنف یا شاعر کے خیالات کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ مزاحیہ انداز میں تنقید کا پہلو نمایاں ہو جائے تو اُسے تحریف یا تحریفِ مضحک کہتے ہیں۔ تحریف یعنی پیروڈی کا مفہوم ''اُلٹا نغمہ'' ہوتا ہے۔ اسی لئے الفاظ کے اُلٹ پھیر، ردّ و بدل کمی بیشی سے نئے معانی و مطالب مُراد ہوتے ہیں جیسے غالبؔ کے مصرع

'سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا'.....کی تحریف یا پیروڈی.....'سینۂ ہمشیر سے باہر ہے دم ہمشیر کا'.....مفہوم بالکل مختلف ہے۔

﴿۶﴾ **نغز:**۔ایسی حاضر جوابی یا برمحل ایسا فقرہ چُست کرنے کو نغز کہتے ہیں جس میں کسی کی ہنسی اُڑانے یا تضحیک کرنے کا نکتہ نمایاں ہو جیسے کسی مشاعرے میں ایک شاعر نے جیسے ہی یہ مصرع پڑھا: 'اب مری شادی کرا دیجے مری ہمشیر سے' تو سامعین میں سے کسی نے فوراً مرحبا کے بجائے بہ آوازِ بلند یہ فقرہ چُست کیا 'مرے حیا'۔

﴿۷﴾ **واسوخت:**۔طنز کی ایک قسم واسوخت بھی ہے جس کے معنی ہیں مخاطب کو جلانا یا رشک میں مُبتلا کرنا۔ایسا شعر یا ایسی بات کرنا جس میں شکوہ شکایت بھی ہو، رنجش کا اظہار بھی ہو اور دھمکی بھی ہو تو اُسے واسوخت کہتے ہیں۔واسوخت عاشقانہ شاعری کی دل چسپ صنف ہے جس کے ذریعہ مایوس اور برگشتہ عاشق اپنے معشوق کو باور کراتا ہے کہ وہ اُس کی بے التفاتیوں سے مجبور ہو کر کسی اور سے دل لگا لے گا۔درج ذیل شعر واسوخت کا بہترین نمونہ ہے ۔

دنیا میں وضع دار حسیں اور بھی تو ہیں معشوق اک تمہی تو نہیں اور بھی تو ہیں

﴿۸﴾ **مقابلہ:**۔مقابلہ کو انگریزی میں کنٹراسٹ (Contrast) کہتے ہیں۔مقابلہ بھی طنز کا ایک حربہ ہے۔اس کے ذریعہ موازنہ یا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے کسی کی ناہمواریوں یا خامیوں کو طنز کے پیرایے میں اُجاگر کیا جاتا ہے جیسے کسی نحیف و لاغر شخص کی ظاہری شکل و صورت کو کسی دیو قامت پہلوان کے مشابہ قرار دی جائے یا کسی لحیم شحیم یا فربہ انداز عورت کو نازک بدن یا انارکلی کہہ کر مخاطب کیا جائے۔

﴿۹﴾ **ہجو:**۔ہجو کو ہجا بھی کہا جاتا ہے۔اس کے لئے انگریزی میں پنچ (Punch) کی اصطلاح مروّج ہے۔ہجو کے مظاہر تنقید، طعن، تشنیع، نوک جھونک، ملامت، پھبتی، تنقیص، تضحیک اور استہزا ہیں۔طنز و ظرافت کی جملہ اقسام میں ہجو سب سے زیادہ سخت گیر اور چبھتی ہوئی قسم ہے۔اس کے ذریعہ نہایت تلخ اور نشتر جیسے کاٹ والے الفاظ میں فرد کی کمزوریوں، سماج کی ناہمواریوں اور معاشرت کی بدنظمی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔جس شخص کی ہجو مقصود ہوتی ہے اُس پر فقرہ چُست کیا جاتا ہے، اُس کا تمسخر اُڑایا جاتا ہے، اُس کی تضحیک کی جاتی ہے۔اگر ہجو میں بے باک تنقید اور اصلاح کا پہلو مضمر ہو تو اُسے ہجو ملیح کہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بیک نظر مدح اور توصیف کا شبہ ہوتا ہے لیکن اس کے مفہوم میں تضحیک کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔مرزا محمد رفیع سوداؔ نے قصیدہ 'شہر آشوب' میں سماج کے مختلف طبقوں کا مضحکہ اُڑایا ہے اور اُن پر فقرے چُست کیے ہیں۔

بطورِ مثال درج ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

مُلّائی اگر کیجیے مُلّا کی ہے یہ قدر ہوں دو روپے اُس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
اور ماحضر آخوند کا اب کیا مَیں بتاؤں یک کاسۂ دالِ عدس و جَو کی دو ناں ہے

﴿۱۰﴾ **طعن:**۔طعن بھی ہجو کی ایک قسم ہے جس کا مقصد بھی کسی کی ہنسی اُڑانا یا کسی کو کمزور یا ذلیل سمجھنا۔طنز کے پیرایے میں براہِ راست تلخ اور سخت الفاظ میں وار کرنے کو طعن کہتے ہیں۔انگریزی میں اس کے لئے سرکازم (Sarcasm) کی اصطلاح رائج ہے جس کے لغوی معنی ''چیرنا'' یا ''چاک کرنا'' کے ہیں۔

﴿۱۱﴾ **ہزل:**۔ہزل میں ذاتیات کو ہدف بنایا جاتا ہے۔اس کے مظاہر عامیانہ مذاق، پھکّڑ پن، فحاشی اور ریختی ہیں۔تہذیب کے باوجود کلام کا مذاق سلیم سے گر جانا اور مبالغہ ہزل کی خصوصیت ہے جس کے ذریعہ طنز کے تیر چلائے جاتے ہیں جیسے ۔

جا پڑی بنتِ عنب پر جو نظر ساقی کی رال داڑھی پہ گری، مُنہ میں بھر آیا پانی

﴿۱۲﴾فقرہ بازی:۔انگریزی میں فقرہ بازی کو رے پیٹ (Repate) کہتے ہیں۔کسی عمدہ بات کی اہمیت کو کم کر کے اس طرح پیش کیا جائے کہ موضوعِ بحث اور کہنے والے ہر دو کی تضحیک ہو اور کہنے والا نظر سے گر جائے۔اکثر فقرہ بازی ایک دو جملوں اور بعض اوقات چند الفاظ پر تمام ہو جاتی ہے جیسے کسی مشاعرے میں ایک شاعر نے شعر پڑھنے سے پہلے داد طلب کرنے کے لئے کہا: حضرات! خالص زبان کا شعر ملاحظہ فرمایئے تو برجستہ کسی سامع نے فقرہ بازی اس طرح کی: واقعی آپ کے مُنہ میں ایک بھی دانت نہیں ہے۔واضح ہو کہ شاعر موصوف ضعیف العمر تھے اور اُن کے تمام دانت گر گئے تھے۔

﴿۱۳﴾ہنسی ٹھٹول:۔ہنسی ٹھٹول کا مقصد ہلکہ پھُلکا مذاق اور ظرافت کے پیرایے میں طنز کرنا ہے۔اس کے ذریعہ کسی کی حماقت اور شیخی مارنے پر اُس کی باتوں کو اُلجھاوے میں ڈال کر ندامت کا احساس کرایا جاتا ہے، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ۔

ہوتا نہیں کچھ کام بھی اُس پردہ نشیں سے آیا نہیں جاتا تو بُلایا نہیں جاتا

﴿۱۴﴾تعریض وتنقیص:۔کسی خاص قباحت یا عام رجحان کے باعث مذاق یا ٹھٹّہ کیا جائے تو اُسے تعریض وتنقیص کہتے ہیں۔ اس قسم کے طنز میں بظاہر تہذیب وسنجیدگی کی جلوہ گری ہوتی ہے۔اسے طنزیہ ظرافت بھی کہا جا سکتا ہے۔عام طور پر طنز نگار بظاہر خود کو طنز کا نشانہ بناتا ہے لیکن اصل وار کسی اور پر ہوتا ہے جیسے غالبؔ کا یہ شعر ۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو ، دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں مَیں

نظیرؔ اکبرآبادی کے کلام میں بھی تعریض وتنقیص کے اچھّے نمونے پائے جاتے ہیں۔بطورِ مثال پیش ہے اُن کی نظم کا درج ذیل بند ۔

مُلّا جو دینے فاتحہ گھر گھر میں جاتے ہیں حلوہ کہیں ،کہیں وہ چپاتی اُڑاتے ہیں
مُفلس کوئی بلاوے تو مُنہ کو چھپاتے ہیں شکّر کا حلوہ سُنتے ہی بس دوڑے جاتے ہیں
کہتے ہوئے یہ دل میں اَہا ہا رِی شبِ برات

﴿۱۵﴾پھبتی:۔کسی کی معصومیت، پارسائی، سیدھے پن، نیکی وغیرہ کا مذاق اُڑانے کے فن کو پھبتی کہتے ہیں۔اس کے ذریعہ کسی کی خامی کو نمایاں کرنے کے لئے نہایت چبھتی ہوئی تشبیہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔فرد کی کمزوریوں اور ناہم وَاریوں کو اُجاگر کرنے کے لئے طعنہ زنی کرتے ہوئے آوازے کسنے اور تلخ جملے استعمال کرنے کو پھبتی کہتے ہیں جیسے ۔

زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت
اور تو مَیں کیا کہوں بَن آئے ہو لنگور سے داڑھی منڈواؤ، مَیں باز آئی خدا کے نور سے

07.05 مزاح کی تعریف

انگریزی میں مزاح کو ہیومر (Humour) کہتے ہیں۔مزاح کا مقصد محض حاصل کرنے اور دوسروں کو محظوظ کرنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ نہایت سلیقہ سے اُن تلخ حقائق کی نقاب کشائی بھی ہے جو قہقہوں کے پسِ پردہ ہوتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ مزاح وظرافت میں طنز کے عناصر مضمر ہوتے ہیں۔مزاح نگار قارئین کو بحرِ انبساط میں اس لئے غوطے لگواتا ہے کہ وہ افسردگی، اضمحلال اور انقباضی کیفیت سے نکال کر سرشاری، سرور اور فرحت کے احساسات سے مغلوب کر سکے۔مزاح نگار زندگی کے مثبت نظریات کا قائل ہوتا ہے۔وہ مایوسی اور محرومی کے

احساس سے بے نیاز ہر حال میں خوش رکھنے کو اپنا مقصد قرار دیتا ہے۔ اُس کے یہاں مایوسی، محرومی اور قنوطیت کفر ہے۔ وہ زندگی کی صعوبتوں سے گھبرا کر راہِ فرار اختیار کرنے کا درس نہیں دیتا بلکہ خوش دلی سے اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ اس طرح انسانی زندگی اور سماج کے لئے مزاح کی اہمیت مقدّم ہے۔ ناقدین اور دانش وَروں نے اپنے اپنے طور پر مزاح سے متعلّق خیالات کا اظہار کیا ہے اور مزاح کی تعریفیں کی ہیں جن کی روشنی میں مزاح کے فن کو اچھّی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

مزاح کی تعریف اسٹیفن لی کاک نے اس طرح کی ہے:

''مزاح زندگی کی ناہم وَاریوں کے اُس ہم دردانہ شعور کا نام ہے جن کا اظہار فن کارانہ طور پر کیا گیا ہو۔''

جے. پی. پریسٹلے نے مزاح کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

''مزاح کی سب سے اچھّی تعریف یہ کی جاتی رہی ہے کہ یہ ہم دردی اور ظرافت سے بھر پور غور و فکر اور احساس ہے۔''

مزاح سے متعلّق شیلے کا قول ہے کہ:

''ہمارے بے فکرے آزاد قہقہوں میں بھی غم کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ہمارے سب سے زیادہ دل کش اور میٹھے راگ وہ ہیں جو کسی نہ کسی تلخ اور ناگوار حقیقت کا پتہ دیں۔''

مزاحیہ ادب کے بارے میں پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

''مزاحیہ ادب صرف تبسّم ہی نہیں غور و فکر کی بھی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے اچھّے مزاح نگار کا رُخ محض اعصاب کی طرف نہیں ہوتا بلکہ پوری شخصیت کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اچھّا مزاحیہ ادب، ادب پہلے ہوتا ہے مزاحیہ بعد میں۔ اس لئے اچھّے ادب کی سی سخت کوشی اور شائستگی چاہتا ہے۔ اس کا انداز ادبی اور پیرایۂ اظہار جمال آفریں ہونا لازمی ہے۔''

مزاح سے متعلّق ڈاکٹر یوسف سرمست کا نظریہ ہے کہ:

''مزاح پھکّڑ بازی سے شروع ہو کر حاضر جوابی اور شوخی کو اپنے دائرہ میں لیتا ہوا ایک انبساطی کیفیت تک پہنچ جاتا ہے...... یہ زندگی کی حقیقت نہیں، زندگی سے فرار کا راستہ ہے۔ مزاح نگار خود قہقہہ لگاتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی قہقہہ کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ مختلف چیزوں کی مضحکہ خیزی کو نمایاں کر کے اُن کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ یہ ہنسنا ہنسانا اصل میں احتجاج ہوتا ہے۔''

وزیر آغا نے مزاح کی تعریف اس طرح کی ہے:

''مزاح زندگی کی ناہم وَاریوں کے ہم دردانہ شعور کا نام ہے جس کا فن کارانہ اظہار ہو جائے۔ مزاح کی یہ توضیح دراصل مزاح کی تخلیق سے متعلّق ہے۔ یہ اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ مزاح نگار اپنی نگاہِ

دوربین سے زندگی کی اُن ناہم وَاریوں اور مضحک کیفیتوں کو دیکھ لیتا ہے جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔''

مزاح سے متعلّق کشن پرشاد کنول کی رائے ہے کہ:

''ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے۔طنز میں ظرافت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل فن ہے۔ظرافت کے لئے خوش دِلی اور مرحمت درکار ہوتی ہے۔طنز میں جوش، رنج، غصّہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر ظہیر احمد صدّیقی نے مزاح سے متعلّق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''ہیومر (Humour) کو مزاح، ظرافت، زندہ دِلی اور شگفتہ مزاجی کہا جا سکتا ہے۔یہ کسی ایک بات یا فقرہ میں چھپا نہیں ہوتا بلکہ کسی بیان کے مضحک و دل چسپ پہلو کے احساس کا نتیجہ ہوتا ہے۔قاری یا سامع کو ہنسی تو ضرور آتی ہے مگر ہم دردی کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔اس کا تعلّق نہ تو ذہن سے ہوتا ہے اور نہ قہقہہ سے۔اس میں ظرافت نگار کو فنّی جذبہ کے ساتھ خیال کی بھی وضاحت کرنی پڑتی ہے۔''

ڈاکٹر ساوتری سنہا نے مزاح کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

''کسی واقعہ، عمل، ماحول، تحریر یا خیالات کے اظہار میں پوشیدہ وہ جذبہ ہے جو اُن کے غیر متعلقہ بے ڈھنگے پن وغیرہ کی وجہ سے انسان کے دل میں ایک خاص طرح کی خوشی یا لطف پیدا کرے، مزاح یا ہیومر ہے۔''

طنز اور مزاح کے فرق کو سلیمان اطہر جاوید نے اس طرح واضح کیا ہے:

''طنز اور مزاح کی جداگانہ اہمیت کے باوجود وہ باہم دِگر مربوط ہوتے ہیں۔ایک طنز نگار اُس وقت تک کامیاب طنز نگار کہلایا نہیں جا سکتا آں کہ اُس نے مزاح سے اپنے فن کو تب و تاب نہ دی ہو۔اسی طرح طنز کے سہارے کے بغیر مزاح کی چاشنی برقرار نہیں رہ سکتی۔طنز محض گالی بن جاتا ہے اور صرف مزاح پھکّڑ پن۔کیفیت و کمیت میں فرق ہوتا ہے لیکن ایسے فن کار بہت کم ہوں گے جنھوں نے محض طنز یا محض مزاح سے کام لیا ہے اور اگر ایسے ہوں بھی تو ادبی اور معاشرتی اعتبار سے ایسے فن کاروں کا وجود اور عدم موجودگی مساوی ہے۔''

مندرجہ بالا مزاح کی تمام تعریفوں کی روشنی میں مزاح کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے:

انسان کی نازیبا حرکات یا معاشرے کی کمزوریوں اور خامیوں کو اصلاحی جذبہ کے ساتھ ہم دردی اور فن کارانہ طور پر منظرِ عام پر لانے اور بے روح سنجیدگی کو دور کرنے کے عمل کو مزاح کہتے ہیں۔

07.06 مزاح کی اقسام

مزاح سرور اور انبساط حاصل کرنے کا بہترین وسیلہ ہے مگر اس کا اصل مقصد ظرافت کے پیرایے میں فرد اور سماج کی برائیوں کو منظرِ عام پر لا کر بدی سے دور رکھنا اور اُسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی خواہش کا پیدا کرنا بھی ہے۔ دراصل ظرافت کے پیرایے میں کہی گئی بات سنجیدہ نصیحت سے زیادہ اثر دار ہوتی ہے۔ مزاح میں غم، غصّہ، تلخی اور طیش کارگر نہیں۔ حصولِ مسرّت اور کسی کی خامی، بدصورتی اور بے تُکے پن پر خوش دِلی سے ہنسنے کا نام مزاح ہے اور خالص مزاح بے ضرر ہوتا ہے۔

مزاح کی مختلف اقسام ہیں جن میں سے درج ذیل کا ذکر مختصراً کیا جا رہا ہے:

﴿۱﴾ **ذاتی مزاح:**۔ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بجائے خود اپنی ہی ذات پر ہنسے تو اُسے ذاتی مزاح کہتے ہیں۔

﴿۲﴾ **غیر ذاتی مزاح:**۔ جب کوئی شخص کسی دوسرے فرد پر ہنسے اور اُسے بھی ہنسائے تو اُسے غیر ذاتی مزاح کہا جاتا ہے۔

﴿۳﴾ **شعوری مزاح:**۔ قصداً یا سوچ سمجھ کر ہنسنے یا کسی کے ہنسانے کے عمل کو شعوری مزاح کہتے ہیں۔ شعوری مزاح میں بعض اوقات مزاح نگار خود بھی ہنستا ہے اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔

﴿۴﴾ **غیر شعوری مزاح:**۔ جب ہنسانے والا اپنی بے وقوفی یا نازیبا حرکات سے لاعلم ہو اور لوگ اُس کی بے وقوفی یا نازیبا حرکات پر ہنسنے کے لئے مجبور ہو جائیں تو اُسے غیر شعوری مزاح کہتے ہیں۔

تحریری اشکال میں مزاحیہ شاعری اور مزاحیہ تحریر کو مزاح نگاری کہا جاتا ہے۔ مزاح نگاری باقاعدہ ایک فن ہے۔ جب مزاحیہ شاعری یا مزاحیہ تحریر پڑھ یا سُن کر کوئی شخص مسکرائے، ہنسے، قہقہے لگائے یا زیرِ لب خندہ زن ہو تو اُسے جسمانی حرکات کی بنیاد پر مزاح کہا جاتا ہے۔ دراصل تبسّم، ہنسی، قہقہہ، مسکراہٹ اور تبسّمِ زیرِ لب کا اظہار مختلف محرکات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان اشکال سے کبھی تندی اور کبھی نرمی ظاہر ہوتی ہے۔ جسمانی حرکات کی بنیاد پر مزاح کی کئی اقسام ہیں جن میں سے درج ذیل نہایت اہم ہیں:

﴿۵﴾ **مزاحِ خفیف:**۔ جب ہنستے وقت انسان کا چہرہ اور آنکھیں روشن ہوں اور دانت برائے نام نظر آئیں تو اُسے مزاحِ خفیف کہتے ہیں۔

﴿۶﴾ **تبسّمِ زیرِ لب:**۔ جب کسی تحریر کو پڑھ کر یا کسی بات کو سُن کر ہونٹوں کے نچلے حصّہ پر ہلکا سا تبسّم نمودار ہو، دانت نظر نہ آئیں اور پلکیں قدرے کھُلی ہوئی محسوس ہوں تو اُسے تبسّمِ زیرِ لب کہتے ہیں۔

﴿۷﴾ **شگفتہ مزاح:**۔ جب کسی تحریر کو پڑھ کر یا کسی بات کو سُن کر آنکھیں اور ہونٹ قدرے سِکُڑ جائیں اور ہلکی ہنسی کے ساتھ چہرے پر سُرخی بھی نمودار ہو جائے تو اُسے شگفتہ مزاح کہتے ہیں۔

﴿۸﴾ **قہقہہ:**۔ قہقہے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ احساسِ کمتری میں مبتلا شخص اپنی کمی یا کمزوری کو چھپانے کے لئے بدتمیزی سے قہقہہ لگاتا ہے۔ احساسِ برتری میں مبتلا شخص دوسروں کی تضحیک کے لئے بلند آواز میں قہقہہ لگاتا ہے۔ نرم دل اور مہذّب شخص کا قہقہہ خوش مذاقی کی علامت ہوتا ہے۔ قہقہہ دار مزاح سے نظروں میں تیزی یا چمک آجاتی ہے، آنکھوں سے آنسو نکلنے لگتے ہیں اور زوردار آواز ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہاتھوں سے بغلوں کو دبا لیا جاتا ہے۔ دراصل قہقہہ ذہین دماغ اور خوش طبعی کی علامت ہے۔

﴿۸﴾ **دیوارِ قہقہہ:** حد درجہ خوشی کا اظہار کرنے یا کسی ہنسی اُڑانے کے لئے مسلسل فلک شگاف قہقہے لگانے کو دیوارِ قہقہہ کہا جاتا ہے۔

﴿۹﴾ **مزاحِ خوش طبع:**۔ جب ہنسنے والی کی ناک قدرے پھول جائے، نظر میں تیزی یا چمک معلوم ہو اور کندھے سکڑے ہوئے محسوس ہوں تو اس طرح کے مزاح کو مزاحِ خوش طبع کہتے ہیں۔

﴿۱۰﴾ **گلوگیر ہنسی:**۔ جب پورا مُنہ کھول کر ہنسا بھی نہ جائے اور ہنسی کی شدّت کو روکنا بھی ممکن نہ ہو تو ایسی ہنسی کو گلوگیر ہنسی کہتے ہیں۔ قہقہہ کو دبانے کی ناکام کوشش سے ایسی آوازیں نکلتی ہیں جسے دوسرے افراد بہ آسانی محسوس کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے مزاح سے خود اعتمادی کے فقدان اور بدتہذیبی کا اظہار ہوتا ہے۔

﴿۱۱﴾ **خندہ استہزا:**۔ تضحیک کی نیت سے دبی دبی سے ہنسی کو خندہ استہزا کہتے ہیں۔ یہ جھنجھلاہٹ یا کھسیانے پن کی علامت ہے۔ ہلکی اور دبی مسکراہٹ، چھپی ہنسی اور آنکھوں کے اشارے سے ایسا تاثر پیدا کیا جاتا ہے جس کا مقصد زیادہ تر تضحیک ہوتا ہے۔

﴿۱۲﴾ **کِلکاری:**۔ عام طور پر بچّوں کی بے اختیار اور بلند آواز ہنسی کو کِلکاری کہا جاتا ہے لیکن جب بڑوں کی زوردار ہنسی میں بھونڈا پن، بے اختیاری اور جہل کا عنصر ہو تو ایسی ہنسی کو بھی کِلکاری کہا جاتا ہے۔

﴿۱۳﴾ **بذلہ سنجی:**۔ جب اچانک ہنسنے کے سبب سَر اور کندھے ہلنے لگے تو ایسے مزاح کو بذلہ سنجی کہتے ہیں۔ اس قسم کی ہنسی میں کبھی کبھی آنسو بھی نکلنے لگتے ہیں۔

﴿۱۴﴾ **چکلّس:**۔ ہلکی اور بے ہنگم ہنسی کو چکلّس ہنسی کہتے ہیں۔ یہ قہقہہ سے کمتر درجہ کی ہوتی ہے۔ اس کی اُٹھان ایسی ہوتی ہے کہ موقع ملنے پر بھی قہقہہ نہیں بن پاتی۔ بعض اوقات کسی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے خوش طبعی سے ٹالنے یا نظرانداز کرنے کے لئے بھی اس طرح کی ہنسی کی آواز نکالی جاتی ہے۔

﴿۱۵﴾ **قُلقُل:**۔ جب ہنسنے کی طرف طبیعت مائل نہ ہو اور زبردستی یا بے دِلی سے بناوٹی ہنسی کی آوازیں نکالی جائیں تو اُسے قُلقُل ہنسی یا قُلقُل مزاح کہا جاتا ہے۔ صراحی سے پانی نکالتے وقت جس طرح کی خاص آواز نکلتی ہے اُسی طرح کی آواز قُلقُل ہنسی کے دوران نکلتی ہے۔

﴿۱۶﴾ **جگ ہنسائی:**۔ دوسروں کو ذلیل و کمتر سمجھتے ہوئے تضحیک کی نیت سے غیر مہذّبانہ انداز میں ہنسنے کو جگ ہنسائی کہا جاتا ہے۔ جن افراد کو عزّت و ناموس اور شرم و حیا کا لحاظ ہوتا ہے وہ جگ ہنسائی سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں کیوں کہ اُن کے نزدیک اس سے بڑی ذلّت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

07.07 طنز و مزاح میں فرق

طنز و مزاح نگاری کا فن بعض مخصوص آزادی اور بعض لازمی پابندی کے باوجود تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا نہایت اہم فکری اور ادبی سرمایہ ہے۔ اس کے ذریعہ افراد و سماج کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا ہے اور حالات و واقعات پر طنز و تضحیک سے پُر تبصرہ بھی کیا جاتا ہے۔ مزاح نگار خامیوں اور خرابیوں کو نمایاں کر کے افراد اور سماج کی اصلاح بھی کرتا ہے اور اُن کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اگرچہ نثری اور شعری ادب کی مختلف اصناف میں جزوی طور پر طنز و مزاح کو کسی نہ کسی شکل میں محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن یہ عام محرکات اور خاص اسالیب کے بہ نسبت مختلف اور امتیازی قسم کے محرکات اور جُداگانہ نوعیت کے اندازِ سخن کا حامل ہے جو اُسے ایک علاحدہ حیثیت اور پہچان عطا کرتے ہیں۔ طنز و مزاح میں

ظرافت کوکلیدی حیثیت حاصل ہے لیکن طنز اور مزاح دونوں کی حیثیت و اہمیت جُدا گانہ ہے۔ دونوں کے محرکات بھی مختلف اور ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

طنز ذکاوتِ حِس کے سبب نمودار ہونے والے ایک ایسے ردِعمل کا اظہار ہوتا ہے جس میں غم وغصّہ اور برہمی و ناگواری کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ سماج اور انسان کی کمزوریوں، خامیوں، خرابیوں، نقائص، بدسلیقگی، بدنمائی، پھوہڑپن، بے ڈھنگی حرکات وغیرہ کو استہزائیہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اُن کے مُضر اور نقصان دہ پہلوؤں کا احساس دلانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ طنز سماج، زندگی اور ماحول سے برہمی کے سبب وجود میں آتا ہے اور اُس میں نشتریت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ طنز نگار جس شخص یا جن عوامل کو ناپسند کرتا ہے اُس کی اصلاح کر کے اُسے تبدیل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔

طنز کے ذریعہ معاشرتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی صورتِ حال اور دیگر قبیح اشیاء میں تبدیلی لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ طنز سے انسان اور سماج دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ وہ طنز کے عمل اور وار سے تڑپتے بھی ہیں اور ندامت کا احساس بھی کرتے ہیں، سبق بھی سیکھتے ہیں اور عبرت بھی حاصل کرتے ہیں، غور وفکر کے لئے آمادہ بھی ہوتے ہیں اور اُن کا احساس بھی بیدار ہوتا ہے۔ دراصل طنز کی روح مقصدیت ہے۔ مقصد کے بغیر طنز بے سود ہوتا ہے۔ شدّت، تلخی اور تیزی طنز کے اہم عناصر ہیں۔ اگر طنز کا وار سہنے والا وار میں لطف محسوس کرے اور اُس کی رگِ ظرافت پھڑک اُٹھے تو ایسے طنز کا شمار بہترین طنز میں کیا جاتا ہے۔ بہتر اور تعمیری طنز اپنے دَور کے سماج اور انسانی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اُس کا اثر آنے والے زمانے تک رہتا ہے۔

طنز و مزاح میں زود حسی اور ظریفانہ مزاج کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ طنز کے برعکس خوش گوار ذہنی رویّوں اور شگفتہ شائستہ ذہنی وفکری رجحانات کا رہینِ منّت ہوتا ہے۔ طنز نگار کی طرح مزاح نگار بھی زندگی اور سماج کے ابتر حالات و مضحکہ خیز معاملات سے متاثر ہوتا ہے۔ دراصل مزاح کی تحریک بھی طنز اور ہجو کی طرح زندگی اور معاشرت کی ناہمواریوں، بے ڈھنگے پن، مضحکہ خیز حرکات اور ابتر حالات کے شعور و احساس سے نمو پاتی ہے لیکن ردِعمل کے طور پر مزاح میں طنز کی طرح برہمی وغصّہ اور ہجو کی طرح حقارت و نفرت کے بجائے ہمدردی اور انبساط کی کیفیت غالب ہوتی ہے۔ اس کا اصل مقصد حصولِ مسرّت ہوتا ہے۔ مزاح کی نمو زندگی کے غیر متناسب اور بے جوڑ مظاہرے کو نمایاں کرنے سے ہوتی ہے۔ مزاح کا مقصد نہ تو ضرررسانی ہے اور نہ اصلاح ہے۔ مزاح نگار مزاح کے ذریعہ دوسروں کے غیر آہنگ افعال اور خود بینی وخودنمائی کے مظاہرے کا تماشا خود بھی دیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی دِکھاتا ہے اور اُن سے انبساط حاصل کرنے کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

طنز نگار اور مزاح نگار کے متعلّق رونالڈ ناکس کا خیال ہے کہ:

''مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے اور طنز نگار کُتّوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔''

طنز و مزاح کے متعلّق پروفیسر سیّد احتشام حُسین لکھتے ہیں کہ:

''طنز و مزاح میں تفریق آسان نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت کا مقصد تفریح ہے اور طنز کا مقصد افراط وتفریط کی اصلاح۔''

طنز ومزاح کے اس سرسری جائزے سے آپ بخوبی واقف ہو گئے ہوں گے کہ دونوں کے محرکات کے اسباب میں بڑی حد تک مماثلت ہے لیکن بہ اعتبارِ ردِّعمل دونوں میں واضح فرق بھی ہے۔طنز برہمی کے ردِّعمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور مزاح مسرّت وخوش مذاقی کے سبب ظاہر ہوتا ہے۔

07.08 طنز ومزاح کی روایت

طنز ومزاح کی روایت عربی سے فارسی میں آئی اور فارسی کے زیرِ اثر اُردو میں داخل ہوئی۔اُردو غزلیات میں واعظ، شیخ، ناصح، زاہد، محتسب وغیرہ کو ہدفِ طنز بنایا گیا۔شعرا نے محبوب اور معشوق کے جور و جفا، ظلم وستم پر خوب خوب موشگافیاں کی ہیں۔داستانوں اور مثنویات کے بعض جملوں، فقروں، اشعار اور مصرعوں کو بھی طنز ومزاح کے اوّلین نمونے قرار دیا جاسکتا ہے۔ہجویات اور شہر آشوبوں میں معاشرے اور عہد کی خرابیوں اور ناہم وَاریوں کی عکّاسی میں طنز ومزاح کی جھلکیوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔معاشرانہ چشمکوں میں ایک دوسرے کو لتاڑنے اور پھبتیاں کسنے کے سبب طنز ومزاح کو فروغ ہوا۔باہمی نوک جھونک، ہجو، ہزل، ضلع جگت اور پھبتیوں کے سبب لطیف طنز ومزاح کے بجائے پھکّڑ پن کے عناصر زیادہ نظر آتے ہیں۔

دورِ ایہام گوئی کی شاعری میں بھی طنز کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔جعفر زٹلی نے سیاسی وسماجی مسائل پر طنز کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اُسے سودا نے ہجویات کے ذریعہ پروان چڑھایا۔میر حسن، میر تقی میرؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ، مصحفیؔ، جرأت وغیرہ کے یہاں بھی طنز ومزاح کے اچھّے نمونے پائے جاتے ہیں۔نظیرؔ اکبرآبادی کی کئی نظمیں معیار واظہار کے لحاظ سے طنز ومزاح کی روایت میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔اُن کے یہاں ظریفانہ رنگ بالکل منفرد ہے۔وہ طنز نگار سے زیادہ مزاح نگار ہیں۔شاہ مبارک آرزوؔ اور مرزا مظہر جانِ جاناں، سوداؔ اور ضاحکؔ، مصحفیؔ اور انشاؔ، آتشؔ وناسخؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کی چشمکوں اور معرکوں سے طنز ومزاح کی روایت میں اضافہ ہوا۔ریختی اور عریاں نویسی میں بھی طنز وظرافت کی جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔

اُردو میں طنز وظرافت کی روایت کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد استحکام حاصل ہوا۔مرزا غالبؔ کے خطوط کی طنزیہ ومزاحیہ تحریروں میں طنز ومزاح کے خالص ادبی نمونے منظرِ عام پر آئے۔غالبؔ نے جدید اسلوب کے ذریعہ لطیف وپاکیزہ طنز ومزاح کی داغ بیل ڈالی۔

'اودھ پنچ' کے قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ طنز ومزاح کو ہمہ گیری، وسعت اور تنوّع عطا کیا جن میں سے رتن ناتھ سرشارؔ، منشی سجّاد حُسین، جوالا پرساد برقؔ، مرزا مچھّو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، عبدالغفور شہبازؔ، نوّاب سیّد محمد آزادؔ، اکبرالہ آبادی، مولوی احمد علی کسمنڈوی اور ظریفؔ لکھنوی قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو طنز ومزاح کی روایت کو فروغ دینے والوں میں مہدی افادی، سجّاد انصاری، سلطان حیدر جوش، میر محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، سجّاد حیدر یلدرم، مولانا ابوالکلام آزادؔ، علاّمہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، ظفر علی خاں، مُلاّ رموزی اور قاضی عبدالغفور کے نام بھی اہم ہیں۔ دَورِ جدید میں انگریزی ادب کے اثرات سے تلخ طنز کے بجائے پرکیف مزاح اور رمز کے لئے راہ ہم وَار ہوئی اور معیاری وادبی طنز ومزاح کو فروغ حاصل ہوا۔اس دَور کے بیش تَر ادیبوں کے یہاں طنز کی نشتریت کم اور خالص مزاح کا رنگ کچھ زیادہ نکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔عظیم بیگ

چغتائی، پریم چند، شوکت تھانوی، مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، امتیاز علی تاجؔ، عبدالماجد دریابادی، شفیق الرحمٰن، رشید احمد صدّیقی اور کنہیّا لال کپور کی نگارشات نے طنز و مزاح کی روایت کو استحکام عطا کیا ہے۔ سیّد محمد جعفری، ابن انشاء، کرشن چندر، سند باد جہازی، عبدالمجید سالکؔ، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی اور مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں اُردو طنز و مزاح کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

07.09 چند طنزیہ و مزاحیہ اقتباسات

درج ذیل طنزیہ مزاحیہ اشعار اور تحریروں کے نمونوں سے مختلف طنزیہ مزاحیہ اسالیب اور اندازِ بیان سے واقفیت ہوگی اور طنزیہ مزاحیہ نگارشات کے تئیں آپ کی دل چسپی میں بھی یقیناً اضافہ ہوگا۔

ترے اَبرو کی پہنچے گر خبر مسجد میں زاہد کو — تماشا دیکھنے آوے ترا، محراب سے اُٹھ کر (ولیؔ)

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیّار ہے وہ — اُس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا (ولیؔ)

تقویٰ کا اُس کے، موسمِ گل نے کیا یہ رنگ — زاہد کو خانقاہ سے مَے خانے لے گیا (سوداؔ)

یہ جو مَہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کُنڈ پر — اَوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر (انشاؔ)

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں — کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں (نظیرؔ)

حنا سی ریشِ سُرخ ، آنکھوں میں سرمہ — لٹیں مہکی ہوئی، زلفیں معطّر (جوشؔ)

نہ جاؤ تم، پڑو چولھے میں، بھیجو میرے بھائی کو — لگے ہیں درد، مَرتی ہوں، بُلا لائے وہ دائی کو (جان صاحب)

شیخ جو ہے مسجد میں، ننگا رات کو تھا مَے خانے میں — جبّہ ، خرقہ ، کرتا ، ٹوپی مستی میں انعام کیا (میرؔ)

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے (غالبؔ)

حامدہ چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بے گانہ تھی — اب ہے شمعِ انجمن ، پہلے چراغِ خانہ تھی (اکبرؔ)

''بھئی قسم ہے خدا کی جیسے ہی جنگل میں پہنچا ہوں، عجب تماشا دیکھا، واللہ باللہ ثم باللہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شیر ببّر دُم پھُلا تا درخت کے سایے میں کھڑا دہاڑ رہا ہے اور ابّا جان کی قسم یہ دیکھیے واللہ کہ اس سے اور مجھ سے کوئی چار پانچ ہی قدم کا فاصلہ ہوگا۔ حضرت میری اُٹھتی جوانی اور گینڈا بنا ہوا۔ مَیں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس شیر کو ایک ہی دفعہ ڈپٹ دیا۔ بھلا بے! آگے قدم بڑھایا اور میں نے بھرپور ہاتھ جمایا۔ تب تو شیر اور بھی غرّایا۔ بس اس پر مجھے بھی غصّہ آ گیا۔ پھر تو حضرت! قسم ہے جنابِ باری کی بندۂ درگاہ بھی جم گئے اور زنّاٹے سے بدن تول کر ولایتی کا ہاتھ جو چھوڑا تو شیر نے تیورا کے منھ موڑا۔ میں نے کہا: او گیدی نامعقول تو شیر ہے یا بھیڑ ہے۔ یہ کہہ کر میں جھپٹ پڑا اور جھپٹتے ہی میاں کی دُم جو دبائی تو ہاتھ میں تھی۔''

(فسانۂ آزاد: رتن ناتھ سرشار)

''آنسوؤں کی قطار ننھی ننھی آنکھوں سے لے کر مختصر ریش مبارک تک اس طرح جاری تھی جیسے تمباکو کے پنڈے پر لگی ہوئی کوڑیوں سے شیرہ۔ بے تکان رال بہنے سے منھ بالکل بھگارا پھیندا، رعشہ دار، ایک ہاتھ

رطوبتِ دماغی کی طغیانی پونچھنے میں اور دوسرا سینہ کوبی میں مصروف۔''

(حاجی بغلول: سجّاد حسین)

''صاحب دین نے ہوش سنبھالتے ہی ایک نظر میں تاڑ لیا کہ قدیم تہذیب وتمدن کا بوسیدہ ڈھانچہ کلیتہً پھونک دینے کے قابل ہے۔اس کی نظر میں یہ محض اتفاق ہے کہ باپ، باپ واقع ہُوا ہے ورنہ ہوسکتا تھا کہ وہ بیٹا ہو۔وہ زیادہ سے زیادہ ''پیارے باپ'' کا مستحق ہے اور اگر زیادہ ترقی کی گنجائش ہوتو ''وہ بڑھا بے وقوف'' کافی ہے...... بھائی ایک رقیب ہے۔اصلی عظمت وعزت کی مستحق زوجہ ہے نہ کہ ماں۔وہ انگریزی اچھّی بولتا ہے یا بُری۔کہنا یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ بولتا ہے۔مثلاً وہ اپنے نوکر، اپنے گھوڑے، اپنے کُتّے حتیٰ کہ اپنے مچھر اپنے کھٹمل اور اپنے جوتے تک سے انگریزی بولتا ہے۔گنگا کو اگر چہ وہ ماں کا محبت آمیز خطاب دیتا ہے مگر کہتا ''گینجیز''ہی ہے۔مکّہ کو مقدس مقام کہتا ہے مگر بولتا ''میکا'' ہی ہے۔ وہ سلطان کو''سلٹن'' اور خلیفہ کو ''کیلف''ہی کہے گا۔''

(صاحب دین: محفوظ علی بدایونی)

''قد ایسا جیسے اخبار کا کالم، بال ایسے جیسے تنخواہوں کی تخفیف، پیشانی ایسی جیسی وہائٹ پیپر، بھنویں ایسی جیسے اسمبلی ہال، پلکیں لکھنے کا باریک نب، نگاہیں کنزرویٹو گورنمنٹ کی پالیسی، رُخسار سرحدی سرخ پوش، ٹھوڑی برٹش ڈپلومیسی اور بالوں کی کتر شامیانہ کی جھالر......''

(خواجہ حسن نظامی)

''تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شبّن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔معلوم ہُوا کہ پھر میری یاد ہوئی، ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا۔گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔''

(مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ: سجّاد حیدر یلدرم)

''یہ تو پانچ ہیں مالک!
پانچ نہیں دس ہیں۔گھر جا کر گننا۔
نہیں، سرکار پانچ ہیں۔
ایک روپیہ نذرانے کا ہوا کہ نہیں؟
ہاں سرکار!
ایک تحریر کا
ہاں سرکار!

ایک کاغذ کا

ہاں سرکار!

ایک دستوری کا

ہاں سرکار!

ایک سوت کا

ہاں سرکار!

پانچ نقد۔دس ہوئے کہ نہیں؟

ہاں سرکار!اب یہ پانچ بھی میری طرف سے رکھ لیجیے۔

کیسا پاگل ہے؟

نہیں سرکار! ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کا نذرانہ ہے، ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کا، ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کے پان کھانے کو، ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کے پان کھانے کو، باقی بچا ایک وہ آپ کے کریا کرم کے لئے۔''

(گؤدان :پریم چند)

''اے میلاد کی غزلوں پر رونے والو! کیا نہ سنا تم نے کہ مبلغ ایک دربار بڑی شان والا منعقد را بیچ لندھن شہر کے، خاص واسطے تاج پوشی بادشاہ کے مگر یہ کہ ہے بے خبری تمہاری۔اے بے خبری حد سے گزری ہوئی با سبب اس کے نہیں ہیں تعلیم پائے ہوئے، بیچ ہندوستان کے مگر اوپر ایک سو کے چند۔''

(ملاّ رموزی)

''بابو کی سیکڑوں قسمیں ہوتی ہیں اور بھانت بھانت کے بابو اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔مگر ان سب کے حالاتِ زندگی صرف یہ ہوتے ہیں کہ دفتر میں کثرتِ کار اور گھر پر کثرتِ اولاد۔دفتر میں ترقّی کی فکر اور گھر پر بیوائن کے تقاضے سے لڑکی کی شادی کا غم۔دفتر میں بڑے بابو کا اندیشہ اور گھر پر رام چرن کی مہتاری کا خطرہ۔دفتر میں اہل معاملہ کے سامنے شیر اور بڑے بابو کے سامنے بھیگی بلّی اور گھر پر بچّوں کے باپ اور بچّوں کی ماں کے صاحبزادے۔'' (بابو:شوکت تھانوی)

''احسن اللہ خان کے نام کے ساتھ ''خانی کا دُم چھلاّ'' لگا ہُوا ہے،مگر پٹھان نہیں ہیں۔نام کے شروع میں 'احسن' ضرور ہے،مگر 'حُسن' کا کوئی تعلّق اُن کی شکل وصورت سے نہیں۔اب رہا 'اللہ' تو اللہ، اُن کے ساتھ کیا، ہر شخص کے ساتھ ہے۔اس لئے اس پر کوئی اعتراض کرنے کا موقع ہی نہیں۔اب رہی خاندانی شرافت و وجاہت، تو بس 'اللہ ہی اللہ' ہے۔مگر یار میرا ایسے لوگوں میں بھی گھُس جاتا ہے، جو دقیانوسی خیالات کے ہیں

اور اَیرے غیروں نتھو خیروں کو اپنے پاس جگہ دینا، اپنی خاندانی عزّت کو بٹّا لگانا سمجھتے ہیں۔ امیر نہیں، مگر امیر اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ پیتا نہیں، مگر پینے والوں کی ہر صُحبت میں شریک رہتا ہے۔ چالیس سے گُزر چکا ہے مگر بچّوں میں بچّہ اور بُڈھوں میں بُڈھا ہے اور جہاں جاتا ہے، وہاں یہ اللہ کا بندہ شمعِ محفل بن جاتا ہے۔''

(یار باش: مرزا فرحت اللہ بیگ)

''کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں لاہور کا حدود اِربعہ بھی ہُوا کرتا تھا، لیکن طلبا کی سہولت کے لئے میونسپلٹی نے اُسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بہ روز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارُالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے، جس کے ہر حصّے پر ورم نمودار ہو رہا ہے، لیکن ورم، موادِ فاسد سے بھرا ہے، گویا یہ تو وسیع عارضہ ہے جو اُس کے جسم کو لاحق ہے۔''

(لاہور کا جغرافیہ: پطرس بُخاری)

''امن وامان اور تمدّنی برکات کے عہد میں قانون کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اصل مُجرم کا چھوٹ جانے سے بہتر ہے کہ بے گناہ سزایاب ہو جائے۔ اس لئے مُلزم کا قصور مُشتبہ ہو تو اُسے رہا کر دینا چاہیے، جس کو دوسرے الفاظ میں یوں لکھتے ہیں کہ شُبہ کا فائدہ مُلزم کو مِلتا ہے، لیکن جہاں اور جس زمانے میں امن وامان کا معاملہ کچھ یوں ہی سا ہو، وہاں کا دستور یہ ہوتا ہے کہ شُبہ کا فائدہ پولیس کو دیا جائے، یعنی اِلزام مُشتبہ ہو، تب بھی مُلزم کو احتیاطاً سزا دے دینی چاہیے۔''

(شیخ پیرو: رشید احمد صدیقی)

''قبرستان بھی جائے عبرت ہے۔ کبھی جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ جس دن اس میں میّت اُتری ہوگی کیسا کہرام مچا ہوگا۔ رونے والے کیسے بلک بلک کے تڑپ تڑپ کے روئے ہوں گے پھر خود ہی رونے والے دوسروں کو رُلاتے ہیں، باری باری پیوند خاک ہوتے چلے گئے۔ صاحب جب یہی سب کچھ ہوتا ہے تو پھر کیسا سوگ کس کا ماتم کاہے کا رونا۔''

(آب گم صفحہ: مشتاق احمد یوسفی)

''اللہ میاں میں حاضر ہوں۔ کیا کہا کہ اب تک کہاں تھے؟ اللہ میاں یہ نہ پوچھئے۔ کیا ارشاد ہُوا کہ ضرور کہوں؟ اللہ میاں کیوں مجھ سے کہلواتے ہو؟ کوئی مولوی غصّے میں آ گیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ ہیں ہیں! یہ کیا ہوا؟ اللہ میاں تم تو خفا ہو گئے۔ میری تو بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔ کیا کہا کہ مولوی کا لفظ سُننا ناگوار ہے۔ مولویوں سے تنگ آ گئے ہو، مگر اللہ میاں انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اب تمہاری خاطر یہ لوگ چھوڑے تو نہیں جا سکتے۔''

(اللہ میاں: عبدالعزیز فلک پیما)

07.10 خلاصہ

طنز ومزاح نگاری کا فن بعض مخصوص آزادی اور بعض لازمی پابندی کے باوجود تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا نہایت اہم فکری اور ادبی سرمایہ ہے۔اس کے ذریعہ افراد وسماج کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا ہے اور حالات وواقعات پر طنز وتضحیک سے پُر تبصرہ بھی کیا جاتا ہے۔مزاح نگار خامیوں اور خرابیوں کو نمایاں کر کے افراد اور سماج کی اصلاح بھی کرتا ہے اور اُن کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔طنز ذکاوتِ حس کے سبب نمودار ہونے والے ایک ایسے ردِعمل کا اظہار ہوتا ہے جس میں غم وغصّہ اور برہمی وناگواری کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔طنز ومزاح میں زود حسی اور ظریفانہ مزاج کو اہمیت حاصل ہے۔یہ طنز کے برعکس خوش گوار ذہنی رویّوں،شگفتہ اور شائستہ ذہنی وفکری رجحانات کا رہینِ منّت ہوتا ہے۔

طنز کو انگریزی میں سیٹائر (Satire) اور مزاح کو ہیومر (Humour) کہتے ہیں۔طنز کسی طنز نگار کے جذبہ اور ماحول کا عکس ہوتا ہے جس میں فرد یا سماج کی کمزوریوں اور ناہمواریوں کو درست کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔اس کا مقصد محض تلخ کلامی اور تیکھا وار نہیں بلکہ ادبی اور مزاحیہ انداز بھی ہے۔استہزا،رمز وکنایہ،ضلع جگت،رعایتِ لفظی،تحریف،نغز،واسوخت،مقابلہ،ہجو،طعن،ہزل،فقرہ بازی،ہنسی ٹھٹول، تعریض وتنقیص اور پھبتی طنز کی اہم اقسام ہیں۔ذاتی مزاح،غیر ذاتی مزاح،شعوری مزاح اور غیر شعوری مزاح کا شمار مزاح کی خاص اقسام میں کیا جاتا ہے۔جسمانی حرکات کی بنیاد پر مزاح کی کئی اقسام ہیں جن میں سے مزاحِ خفیف،تبسّمِ زیرِ لب،شگفتہ مزاح،قہقہہ،دیوارِ قہقہہ، مزاحِ خوش طبع،گلوگیر ہنسی،خندہ استہزا،کلکاری،بذلہ سنجی،چکلّس،قُلقُل اور جگ ہنسائی نہایت اہم ہیں۔طنز ومزاح کے اوّلین نمونے غزلیات،مثنویات،قصائد،ہجویات اور معاشرانہ چشمکوں میں پائے جاتے ہیں۔

07.11 فرہنگ

آؤ دیکھا نہ تاؤ : بغیر سمجھے بوجھے،بنا کچھ سوچے

اُٹھتی جوانی : آغازِ جوانی،شباب کا آغاز

احسن : بہت خوب صورت،نہایت حسین

اسمبلی ہال : Assembly-Hall۔مجلسِ قانون ساز کی وہ بڑی جگہ جہاں بیٹھک یا میٹنگ کی جاتی ہے

اللہ ہی اللہ ہے : خدا کی ذات کے سِوا سب ہیچ ہے

انعام کرنا : انعام دینا،بخش دینا،عطا کرنا

اوتار : ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق خدا کا کسی جسم میں داخل ہو کر مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں آنا

ایرا غیرا نتھو خیرا : ادنیٰ حیثیت والا،بے حقیقت شخص،ہر کوئی

بابو : منشی،محرّر،کلرک Clerk

ببوائن : بابو کی بیوی،بابو کی زوجہ

دائی : بچّہ پیدا کرانے کا پیشہ کرنے والی عورت

درد لگنا : دردِزہ ہونا،بچّہ پیدا ہونے کا درد محسوس ہونا

دکھایا جانا : پیش کیا جانا،ملاحظہ کرایا جانا

دُم پھلانا : جانوروں کا دُم کو موٹا کر کے غصّہ کا اظہار کرنا

دُم چھلّا : چھوٹی دُم،پونچھڑی

ڈپٹ دینا : دھمکا دینا،ڈانٹ دینا

ڈپلومیسی : حکمتِ عملی،Diplomacy

رادھا : کرشن جی کی ایک محبوبہ کا نام،ایک گوپی کا نام جو کرشن جی کی معشوقہ تھی

شمع انجمن : محفل کی شمع،رونقِ محفل،جانِ محفل

شیر : جواں مرد،بہادر،دلیر

شیرِ ببر : ایک قسم کا بڑا شیر جس کی گردن پر بال ہوتے ہیں

بڑے بابو : صدرِ محرّر، کلرکوں کا افسر ہیڈ کلرک، Head-Clerk

بسم اللہ ہی غلط : ابتدا ہی غلط، شروعات ہی نامبارک

بےخبری : غفلت، ناسمجھی

بھانت بھانت : طرح طرح، الگ الگ وضع قطع، مختلف قسم

بھیگی بلّی : عاجز، مسکین

پنڈا : گولا، مُگدر

پیوندِ خاک ہونا : خاک میں مِل جانا، زمین میں دفن ہو جانا، مر جانا

پھونک دینا : جلا دینا، نذرِ آتش کر دینا

پالیسی : سیاسی تدبیر، Policy

تاج پوشی : تاج پہننا

تاڑ لینا : بھانپ لینا، کسی علامت کے بغیر پہچان جانا

تماشا دیکھنا : نظارہ کرنا، دیکھ کر لطف حاصل کرنا

تقویٰ : پرہیزگاری، پارسائی

تنگ آنا : عاجز آنا، پریشان ہونا

تمدّنی : طرزِ معاشرت سے متعلّق

جبّہ : چوغہ، ایک قسم کا ڈھیلا لباس جس کی آستین کلائی سے اوپر ہوتی ہے

جم جانا : دلیری سے مقابلہ کرنا

چراغِ خانہ : گھر کا چراغ، گھر کی زینت، گھریلو لڑکی

چمکنا : رونق پانا، نام پانا، مشہور ہونا، شوخ ہونا

چولھے میں پڑنا : آگ لگ جانا، خاک میں مل جانا

جھپٹ پڑنا : غیر معمولی پھُرتی سے کام لینا، تیزی سے وار کرنا

چھوٹ جانا : رِہا ہو جانا، بَری ہو جانا

سینہ کوبی : چھاتی کوٹنا، سینہ پر ہاتھ مارنا

کالم : صفحہ کا حصّہ، خصوصاً اخبار کے صفحہ کا خانہ Column

کثرتِ اولاد : اولاد کی زیادتی، بہت سے بچّے

کثرتِ کار : بہت زیادہ کام، کثیر کام

کلیتہً : پورے طور پر، پوری طرح

کُنڈ : غار، پوجا کرنے کا گڑھا

کوڑی : ایک قسم کا چھوٹا سنکھ جس کا استعمال پیسے کی طرح کیا جاتا تھا، مال، زر

کہرام مچنا : رونا پیٹنا مچنا، شور وشیون ہونا

گرنا : مائل ہونا، فدا ہونا، فریفتہ ہونا

گیدی : بہت بڑا بے وقوف، احمق الذی، نہایت اُجڈ

لاحق ہونا : کسی چیز کے پیچھے لگا ہونا، وابستہ ہونا

لٹیں : لٹ کی جمع، بالوں کی لڑیاں، زلفیں

مشتبہ : مشکوک، جس میں شبہ ہو

لندھن : لندن، انگلینڈ کے ایک مشہور شہر کا نام

مہَنت : جوگی، سنیاسی، سادھوؤں کا سردار

موسمِ گُل : بہار کا موسم

مہتاری : ماں، والدہ

مِیل : ڈاک، Mail

میلاد : پیدائش کا دن، حضورِ اکرم کی پیدائش کی محفل

میونسپلٹی : بلدیہ، شہر کی صفائی، پانی، روشنی وغیرہ کا انتظام کرنے والا ادارہ، Municipality

نِب : Nib، دھات کی بنی ہوئی قلم کی زبان جس سے لکھتے ہیں

واقع ہونا : بروئے کار ہونا

حتّٰی	: یہاں تک، اس قدر	واللہ	: خدا کی قسم، بے شک
حد سے گزرنا	: حد سے باہر ہو جانا	واللہ باللہ	: اللہ کی دوہری قسم، قسم میں زور پیدا کرنے کے لئے بولتے ہیں
حدودِ اربعہ	: چاروں سمتیں یعنی شمال، جنوب، مشرق اور مغرب	ہاتھ جمانا	: وار کرنا، ہاتھ مارنا
خِرقہ	: ایک قسم کا لباس جسے درویش اور عالم پہنتے ہیں	ہوش سنبھالنا	: بالغ ہونا، سیانا ہونا، عقل حاصل کرنا
دارالخلافہ	: دارالحکومت، حکومت کا صدر مقام	یاد ہونا	: بُلانا، طلب کرنا

07.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ طنز کی تعریف اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ قہقہہ کی اقسام کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ مزاح کی تعریف اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ طنز کی اقسام کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۲ مزاح کی اقسام کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ طنز و مزاح میں کیا فرق ہے؟ واضح کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : طنز کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

(الف) Sketch (ب) Satire (ج) Humour (د) Novel

سوال نمبر۲ : مزاح کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

(الف) Essay (ب) Story (ج) Humour (د) Satire

سوال نمبر۳ : ''مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے اور طنز نگار کُتّوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔'' کس کا قول ہے؟

(الف) ولیم ہیزلٹ (ب) جے. پی. پریسٹلے (ج) جیمس سدرلینڈ (د) رونالڈ کاکس

سوال نمبر۴ : 'طنز' کے ساتھ اکثر کس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے؟

(الف) ہزل (ب) مزاح (ج) استہزا (د) ہجو

سوال نمبر۵ : 'سینۂ ہمشیر سے باہر ہے دم ہمشیر کا' مذکورہ مصرع میں طنز کی کون سی قسم ہے؟

(الف) نغز (ب) ہزل (ج) فقرہ بازی (د) تحریف

سوال نمبر۶ : مندرجہ ذیل قول کس شخصیت کا ہے؟

''طنز ومزاح میں تفریق آسان نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت کا مقصد تفریح ہے اور طنز کا مقصد افراط وتفریط کی اصلاح''

(الف) وزیرآغا (ب) رشیداحمدصدّیقی (ج) پروفیسرسیّداحتشام حُسین (د) پروفیسرمحمدحسن

سوال نمبر۷ : 'اُلٹا نغمہ' کے مفہوم کے لئے انگریزی کی کون سی اصطلاح رائج ہے؟

(الف) Parody (ب) Punch (ج) Irony (د) Contrast

سوال نمبر۸ : درج ذیل میں سے کس قلم کار کا شمار طنز ومزاح نگار میں نہیں کیا جاتا ہے۔

(الف) کلیم الدّین احمد (ب) رشیداحمدصدّیقی (ج) مرزافرحت اللہ بیگ (د) مشتاق احمد یوسفی

سوال نمبر۹ : مندرجہ ذیل شعر میں طنز کی کون سی قسم ہے؟

ہمارے ہاتھ کی پہنچی بجن جو آپ نے بھیجی ☆ اگر پہنچی، وہ پہنچی کیا جو پہونچے تک نہیں پہنچی

(الف) رمزوکنایہ (ب) رعایتِ لفظی (ج) واسوخت (د) تحریف

سوال نمبر۱۰ : طنز وظرافت کی جملہ اقسام میں سب سے زیادہ سخت گیر قسم کون سی ہے؟

(الف) ہجو (ب) استہزا (ج) فقرہ بازی (د) رمزوکنایہ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) Satire
جواب نمبر۲ : (ج) Humour
جواب نمبر۳ : (د) رونالڈ کاکس
جواب نمبر۴ : (ب) مزاح
جواب نمبر۵ : (د) تحریف
جواب نمبر۶ : (ج) پروفیسرسیّداحتشام حُسین
جواب نمبر۷ : (الف) Parody
جواب نمبر۸ : (الف) کلیم الدّین احمد
جواب نمبر۹ : (ب) رعایتِ لفظی
جواب نمبر۱۰ : (الف) ہجو

07.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح از ڈاکٹر وزیرآغا
۲۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح از غلام احمد کاکوروی
۳۔ اُردو نثر کا فنّی اِرتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۴۔ طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ از خواجہ عبدالغفور

اکائی 08 اُردو کے اہم طنز ومزاح نگار

ساخت

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : پنڈت رتن ناتھ سرشار

08.04 : اکبرالہ آبادی

08.05 : سجّاد حیدر یلدرم

08.06 : مرزا فرحت اللہ بیگ

08.07 : پطرس بخاری

08.08 : رشید احمد صدّیقی

08.09 : مشتاق احمد یوسفی

08.10 : خلاصہ

08.11 : فرہنگ

08.12 : سوالات

08.13 : حوالہ جاتی کتب

08.01 اغراض ومقاصد

آپ بخوبی واقف ہوں گے کہ اُردو ادب کے نثری وشعری سرمایہ میں طنز ومزاح سے متعلّق بہت سی گراں قدر تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں جن کے مطالعہ سے اس فن سے متعلّق معلومات اور متعلقہ قلم کاروں کی فنّی خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔طنز ومزاح کے میدان میں بہ اعتبارِ اسلوب وموضوعات متعدد فن کار منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل ہیں جن کے فن، اسلوب اور نگارشات سے متعلّق اُردو کے ہر طالبِ علم کو اس قدر واقفیت ہونا چاہیے کہ اُن کی بنیادی، منفرد اور اہم خصوصیات سے آگاہی ہو جائے۔

مندرجہ بالا اغراض ومقاصد کے تحت اس اکائی میں اُردو کے اہم طنز ومزاح نگاروں میں سے رتن ناتھ سرشار، اکبرالہ آبادی، سجّاد حیدر یلدرم، مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدّیقی اور مشتاق احمد یوسفی کی طنز ومزاح نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

08.02 تمہید

ہنسنا اور ہنسانا انسان کی فطرت ہے۔ انسان دوسروں کو ہنسانے اور خود ہنسنے کے مختلف بہانے تلاش کرتا ہے۔ اسی ضرورت کے تحت ہنسنے اور ہنسانے کے نت نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ ادب کے ذریعہ ہنسانے کے فن کو مزاح کہا جاتا ہے۔ مہذّب سماج میں پھکڑ پن اور بھونڈی ہنسی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اس لئے مزاح نگاروں نے ظریفانہ ادب میں مسلسل نفاست پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اعلیٰ درجہ کا مزاح قاری کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے اور اُس کے ذہن و دل کو فرحت عطا کرتا ہے۔ اس کے برعکس طنز میں تلخی، تیزی اور نشتریت ہوتی ہے۔ طنز بامقصد ہوتا ہے اور اصلاح اس کا مدعا ہوتا ہے۔ اُردو کی بیش تر تخلیقات طنزیہ و مزاحیہ ہیں کیوں کہ طنز کے بغیر مزاح کو اور مزاح کے بغیر طنز کو نامکمّل خیال کیا جاتا ہے۔ طنز کے بغیر خالص مزاح تو خوش گوار ہوسکتا ہے مگر طنز میں مزاح نہ ہو تو قاری یا سامع کو تلخی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

آپ اس اکائی میں جن طنز و مزاح نگاروں اور اُن کے فن کی خصوصیات کا مطالعہ کریں گے اُن میں سے بیش تر قلم کاروں کی نگارشات طنزیہ بھی ہیں اور مزاحیہ بھی۔ بعض فن کاروں کے یہاں مزاحیہ عنصر کی فراوانی کے باوجود طنز کی جھلکیاں کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آجاتی ہیں۔

08.03 پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ کے ایک کشمیری برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے مضامین لکھنے کا آغاز 'مراسلۂ کشمیر' اور 'کشمیر درپن' نامی رسائل سے کیا۔ وہ کچھ دنوں اودھ پنچ اخبار سے بھی وابستہ رہے جس میں اُن کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ اس اخبار کے مضامین سرشارؔ کے پرانے اسلوب کے بجائے نئے اسلوب کے غمّاز ہیں۔ اس نئے طرزِ اسلوب نے لوگوں کو سرشارؔ کی طرف متوجّہ کیا۔ اُنہوں نے علمِ طبعی کے موضوع سے متعلّق کتاب کا ترجمہ 'شمس الضحیٰ' کے نام سے کیا۔ سرشارؔ کی ادبی شہرت اور روز افزوں ترقّی سے متاثر ہوکر منشی نول کشور نے اُنہیں اپنے 'اودھ اخبار' کا مدیر مقرر کر دیا۔ سرشارؔ کی ادارت میں ''اودھ اخبار'' کو بہت جلد عروج حاصل ہوا۔

سرشارؔ کا شہرہ آفاق ناول ''فسانۂ آزاد'' اسی اخبار میں دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے دسمبر ۱۹۸۰ء میں چار ضخیم جلدوں میں پوری تقطیع کے تقریباً سوا تین ہزار سے زائد صفحات اور تقریباً سولہ لاکھ ساٹھ ہزار الفاظ پر مشتمل کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔ رتن ناتھ سرشارؔ کے یہاں طنز کم اور مزاح کا عنصر زیادہ ہے۔ سیر کہسار، جامِ سرشارؔ، رنگے سیار، کامنی، پی کہاں، بچھڑی دلہن، کڑم دھم سرشارؔ کی قابلِ قدر کتابوں کے نام ہیں۔ اُنہوں نے الف لیلہ کا بھی ترجمہ کیا ہے اور ڈان کوئک زوٹ کو خدائی فوج دار کے عنوان سے ترجمہ کے ذریعہ اُردو کا جامع عطا کیا ہے لیکن 'فسانۂ آزاد' اُن کا شاہ کار ناول ہے۔ اس کا شمار اُردو کے اوّلین اور بہترین ناولوں میں کیا جاتا ہے۔ اس ناول کے ذریعہ طنز و مزاح کے پیرائے میں اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج کی عکّاسی کی گئی ہے۔ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کے جیسے دل کش اور جیتے جاگتے نمونے اس ناول میں نظر آتے ہیں ویسے کسی اور تصنیف میں نہیں مل سکتے۔ اُنہوں نے مزاح کے پردے میں اپنے عہد کی تلخیوں اور ناہم وَاریوں کو جس طرح اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ لائقِ تحسین ہیں۔ سرشارؔ نے لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت اور معاشرت سے وابستہ عوامل کو ظریفانہ انداز سے نشانہ بنا کر غیر متوازن اور غیر معتدل جدید طرزِ فکر اور مغرب زدگی کی جس طرح سرزنش کی ہے اُس سے اُن کا ذاتی موقف بھی بڑی حد تک ظاہر ہونے لگتا ہے۔

سرشار معاشرتی زندگی کے بہت بڑے رمز شناس تھے۔ اُن کی سب سے اہم فن کاری یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات کو کہانی میں اُبھرنے نہیں دیتے اور قصّہ پڑھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ جس تہذیب کی عکّاسی کر رہے ہیں اُس کے مٹنے کا اُنہیں غم ہے یا نہیں؟ ہاں وہ پرانے اور دقیانوسی رنگ ڈھنگ کو ترک کرنے اور نئی زندگی کے استقبال کرنے کے خواہاں ضرور معلوم ہوتے ہیں۔

رتن ناتھ سرشار کے یہاں اگر چہ طنز کی فراوانی نہیں ہے تاہم جب وہ لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت سے وابستہ افراد کے رجحانات اور شہریوں کی اوہام پرستی، مذہبی رسومات میں اُن کے استغراق، معلّمین کی جہالت، مولویوں اور پیروں کی بداعمالیوں، شعرا، وکیلوں اور بانکوں کے نظریات، چانڈو اور افیون کی لت اور نوّاب اور نوّاب زادوں کی مکروہ عادات کو طشت ازبام کرتے ہیں تو اُن کے طنز کی نشتریت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے مثلاً:

> ''میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مجسّم شامت، پستہ قامت، کوتاہ گردن، تنگ پیشانی، شرارت اور خباثت کی نشانی، کھڑا دور ہی سے جھولوں پر نگاہِ بد ڈال رہا ہے۔ جب اُنہوں نے کئی بار یہ کیفیت دیکھی تو اُن سے رہا نہ گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چپت زنّاٹے سے جما ہی تو دی۔ ٹیپ کھاتے ہی وہ جھلاّ اُٹھا اور گالیاں دے کر کہنے لگا کہ نہ ہوئی ولایتی اس وقت پاس ورنہ بھُٹّا سا سر اُڑا دیتا۔''

'فسانۂ آزاد' کے دو اہم مزاحیہ کردار آزاد اور خوجی اپنے عہد کے دو متضاد تہذیبی اور معاشرتی رویّوں کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ سرشار نے ان کرداروں کی مدد سے ایک طرف لکھنؤ کی پرانی ملمّع زدہ تہذیب کو ہدفِ طنز بنایا ہے تو دوسری طرف اُس نئے سماجی شعور کا بے باکی سے تجزیہ بھی کیا ہے جو اُس وقت نہایت شدّت کے ساتھ عجیب بے ڈھنگے طریقہ سے نمودار ہو رہا تھا۔ 'فسانۂ آزاد' کا کردار آزاد نئے سماجی شعور کا عکّاس ہے۔ وہ بنیادی طور پر اپنے زمانہ کے اُس عام انسان کی طرح ہے جو ماضی کی فرسودہ روایتوں کے بندھنوں کو توڑنے کے لئے بے تاب نظر آتا ہے۔ دوسری طرف خوجی پرانی تہذیب کا علم بردار ہے جس کی شخصیت میں سُستی، بزدلی، ناکردگی، تصنّع، ظاہرداری اور جھوٹی شان و شوکت کے تمام عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ سرشار کے مزاج کا سب سے بڑا معاون خوجی ہی ہے جو قدم قدم پر عملی مذاق سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ وہ مضحکہ خیز پہلو اور اپنے مسخرے پن سے قارئین کو ہنسانے اور بلند بانگ قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

بطورِ مثال پیش ہے خوجی سے متعلّق 'فسانۂ آزاد' کا ایک مختصر اقتباس:

> ''خوجی جب سے اوجھل ہوئے تو میاں آزاد چپکے سے آدھا دودھ کھا گئے اور کٹورا لبالب کرنے کے لئے حوض سے پانی لے کر بھر دیا۔ اتّفاق سے ایک چھوٹی سی مچھلی بھی پانی کے ساتھ کٹورے میں آ رہی.....اس پر میاں آزاد نے کہا: ارے! کھا جا یہ شیرِ ماہی ہے۔ تب تو میاں افیمچی نہایت ہی افسوس کرنے لگے۔ ہائے ہائے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ شیرِ ماہی ہے ورنہ کچّا ہی چبا جاتا۔ اس قسم کی مچھلی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اسّی برس کا بڈّھا کھائے تو جوان ہو جائے۔ نئے سرے سے دانت نکل آئیں۔''

سرشار کے اسلوبِ نگارش میں مزاح کے متعدد رنگ جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کا شگفتہ اندازِ بیان اُن کی تحریروں کو دل نشین اور اثر انگیزی سے لبریز رکھتا ہے۔ وہ مزاح اور ظرافت کے ذریعہ زندگی کی سنجیدگی اور تلخی کو کم کر کے خوش گوار بنانے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ چوروں کے منتر کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''آج کل مہنگی کا سمے ہے۔کون جانتا ہے کیسا وقت آپڑے۔ دہی مچھلی کے ٹکّے ،کہیں اٹکے نہ کہیں بھٹکے،ہتھّا مارا اور سٹکے۔یا فیروز شاہ شکاری! چڑیا ہماری دُم تمہاری۔''

نثر کے علاوہ سرشارؔ کو طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں بھی اہم مقام حاصل ہے۔اگر چہ اُنہوں نے باقاعدہ طور پر طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے نمونے پیش نہیں کیے ہیں مگر 'فسانۂ آزاد' میں ساقی نامہ اور مثنوی کی پیروڈی اُردو شاعری کی اہم اور اوّلین تحریفوں میں سے ایک ہیں جیسے ۔

پلا ساقیا مالوے کی اَفیم کہ کر آؤں گُل گشتِ باغِ نعیم
نہ مطرب نہ ساغر نہ مینا نہ چنگ نہ چانڈو نہ اَفیوں نہ گانجا نہ بھنگ
کرم کر فقیروں پہ مائی ڈِیَر مَیں قربان جاؤں ذرا کم ہیر

اور آخر میں بطورِ نمونہ درج ہیں اُن کی ایک پیروڈی کے یہ اشعار ۔

پلا ساقی افیونِ پینک فزا بہت غم سے جی میرا گھبرا گیا
مراحل مصیبت کے طے ہو گئے افیمی بھی پینک میں سب سو گئے
بس آگے نہیں تاب کچھ ہو رقم کہ پینک میں اب جھومتا ہے قلم
بنامِ خدائے بصیر و سمیع ہمیں گفتہ بود ست خواجہ بدیع

08.04 اکبرالہ آبادی

اکبرالہٰ آبادی کا نام سیّد اکبر حُسین اور تخلص اکبرؔ ہے۔اُن کی پیدائش ۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو ضلع الہٰ آباد کے قصبہ بارہ میں ہوئی۔اُنہوں نے کئی سرکاری نوکریاں کیں اور ترقّی کرتے کرتے جج کے عہدہ پر مامور ہوئے۔اُنہیں خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔اکبر کی شہرت واہمیت سرکاری ملازمت یا خدمات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اُن کے اندازِ بیان اور طرزِ تخیّل میں مضمر ہے۔اُنہوں نے قدیم طرزِ فکر سے کنارہ کشی اختیار کر کے شوخی وظرافت اور طنز ومزاح کے میدان میں نئے نئے گُل کھلائے۔

اکبرؔ نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اُس عہد میں ہندوستانی معاشرت میں عظیم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔وہ جب جوان ہوئے تو پورے ہندوستان میں انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔غدر کی صعوبتوں سے تنگ آ کر مسلمانوں کا متوسط طبقہ انگریزی حکومت سے سمجھوتا کر چکا تھا۔لوگ مغربیت کے سیلاب میں بہہ کر احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے تھے اور انگریزوں کی تقلید ہی کو اپنا مفاد سمجھتے تھے۔مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کے سبب ہندوستانی تہذیب،قومی روایت اور اسلامی کلچر تباہ ہو رہا تھا۔اکبرؔ نے ایسے پُر آشوب ماحول اور اپنے دَور کی مختلف اقسام کی جدّ وجہد کو شعوری طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔اُنہوں نے اُس وقت کے چھوٹے بڑے تمام واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔دراصل یہ ایک طرح کی نئی حقیقت پسندی تھی جس کے ذریعہ اُنہوں نے طنز وظرافت کے پیرایے میں نظم کی شکل میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔اُنہوں نے نہ صرف نئی تہذیب اور نئے تمدّن کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کی بلکہ برٹش سامراج کی عیّاریوں اور چالوں کا پردہ بھی فاش کیا۔

اکبرالہٰ آبادی رعایتِ لفظی،تصرّف،تحریف،محاورہ اور انگریزی زبان کے الفاظ کی آمیزش سے جدّت وظرافت پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔اُنہوں نے سیاسی،مذہبی،معاشرتی اور شخصی زندگی کے بہت سے مکروہ پہلوؤں اور ناگوار گوشوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے مگر اُن کے طنز ومزاح کا اصل نشانہ مغربی طرزِ معاشرت ہے جیسا کہ درج ذیل اشعار سے بھی ظاہر ہے ۔

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے، پتلون بھی ہے بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی، صابون بھی ہے
لیکن مَیں پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی !! یورپ کا تِری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پاکر خطاب، ناچ کا بھی ذوق ہو گیا ''سر'' ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کر دیا کرزن نے زَن،مردوں کی صورت دیکھیے آبرو چہرے کی سب فیشن بنا کر چھین لی
خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں حجاب اُن کو نہیں آتا، اِنہیں غصہ نہیں آتا

اکبؔر کے نزدیک:

''ایسی ظرافت جو نری ظرافت ہو اور اُس کے اندر کوئی اخلاقی نصیحت نہ ہو، کوئی نکتہ مذہبی، سوشل اور فلسفیانہ پیدا نہ ہو، اچھّی نہیں معلوم ہوتی۔''

اکبؔر کے کلام میں ظرافت کے ایسے نمونے بھی پائے جاتے ہیں جو ابتذال کی حدود کو چھو لیتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو نہایت لطیف بھی ہیں اور لطف اندوز بھی۔ وہ طنزیہ پیرائے میں تلخ اور تیکھی باتیں ظرافت کی چاشنی میں لپیٹ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ انسان خود بخود غور و فکر کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اکبؔر کے درج ذیل مشہور اشعار خالص طنز اور ظرافت کے بہترین نمونے ہیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں اکبؔر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟ کہنے لگیں کہ عقل پہ مَردوں کی پڑ گیا

☆

حامدہ چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بے گانہ تھی اب ہے شمعِ انجمن، پہلے چراغِ خانہ تھی

اکبؔر کے ظریفانہ اور مزاحیہ کلام میں درد و کسک بھی ہے اور نصیحت کی تلخی بھی ہے اور ناخوش گواری بھی ہے۔ اُن کا اسلوب اس قدر شگفتہ اور دل کش ہے کہ تلخی اور تیکھے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ شیخ، بدّھو، جمّن، لیڈر، مرزا، واعظ، اونٹ، ٹٹّو جیسے تمثیلی کرداروں اور خاص اصطلاحات کی آڑ میں نہایت معنی خیز مطالب بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں جیسے۔

شیخ کو وَجد میں لاتی ہیں پیانو کی دُھنیں پیچ دستارِ فضیلت کے کھُلے جاتے ہیں
مرزا غریب چُپ ہیں، اُن کی کتاب رَدّی بدّھو اکڑ رہے ہیں، صاحب نے یہ کہا ہے
اولڈ مرزا مفت میں بدنام ہیں ینگ بُدّھو وارثِ اسلام ہیں
شیخ جی کے دونوں بیٹے با ہُنر پیدا ہوئے ایک ہیں خفیہ پولس، میں ایک پھانسی پا گئے
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حُکّام کے ساتھ رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
سِدھاریں شیخ کعبہ کو، ہم انگلستان دیکھیں گے وہ دیکھیں گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

غرض اکبرالہ آبادی نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعہ قوم کی اصلاح اور اخلاق کی درستی کی بھرپور کوشش کی ہے اور ظریفانہ انداز میں نہایت سبق آموز نکتے بیان کیے ہیں۔

08.05 سجّاد حیدر یلدرم

سجّاد حیدر یلدرم ۱۸۸۸ء میں ضلع بجنور کے قصبہ نہٹور میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں تُرکی زبان میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ پہلے ایسے ادیب ہیں جنہوں نے تُرکی زبان کی نگارشات کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اُنہوں نے تُرکی طرزِ معاشرت اور حُسنِ ادا کو اُردو دنیا میں مانوس کرانے کے لئے اُردو کی بہت سی ترکیبوں میں اجتہاد بھی کیا ہے جو اُردو ادب کے لئے کسی گراں قدر اضافہ سے کم نہیں۔ اُن کی نثر رنگین اور معنی خیز ہوتی ہے جس میں طنز ومزاح کی زیریں لہروں کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے تُرکی زبان کے جن ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے اُن کے نام ''زہرہ، ثالث بالخیر، جنگ وجدل، جلال الدّین خوارزم شاہ، مطلوبِ حسینہ، آسیبِ اُلفت اور حکایات واحساسات'' ہیں۔ اُنہوں نے فارسی زبان کی ایک تخلیق کا ترجمہ 'ہما خانم' کے نام سے کیا ہے۔ یلدرم نے ان تراجم کے ذریعہ اُردو کے قارئین کو ایک نئے رنگ وآہنگ سے روشناس کرایا ہے۔ اُن کے افسانوں کے مجموعہ کا نام 'خیالستان' ہے۔ وہ ادبِ لطیف کے نمائندہ قلم کار ہیں لیکن اُن کا رومان روزمرّہ کی زندگی کے درمیان ہی کا رومان ہے۔ اُن کے کردار بھی ہمارے ہی اردگرد کے ہیں جن سے مل کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

سجّاد حیدر یلدرم کا مزاج نہایت لطیف اور سُلجھا ہوا ہے۔ زبان وبیان پر عبور حاصل ہونے اور ترکی کے رومانی ادب سے واقفیت ہونے کے باعث اُن کی تحریروں میں دل کشی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ وہ نہ تو ہنسوڑ ہیں نہ مضحکہ خیز بات کرتے ہیں اور نہ بات بات سے لطیفے پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ اس کے برعکس وہ مسکراہٹ، ہلکی ہنسی اور تبسّمِ زیرِلب کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ رومانی ماحول کی عکّاسی بڑے سلیقے سے کرتے ہیں البتہ کہیں کہیں وہ ہنسی کے ایسے نقوش اُبھارتے ہیں کہ قارئین بے اختیار اُن کے ہم نوا ہو کر ہنسنے لگتے ہیں۔ اُنہوں نے 'چڑیا چڑے کی کہانی' میں نہ صرف نہایت خوب صورت فضا پیدا کی ہے بلکہ ایک قسم کے میٹھے میٹھے طنز سے بھی کام لیا ہے۔ اُن کا شگفتہ مزاج نرمی کے باعث نشتریت کی سطح تک تو نہیں پہنچتا لیکن قارئین کو اُس کی نوکیلی اور دھاردار کیفیت کا احساس ضرور ہو جاتا ہے۔

بطورِ مثال پیش ہے ''چڑیا چڑے کی کہانی'' سے ماخوذ درج ذیل اقتباس:

> ''اور انسان تو چلے گئے۔ بس ایک انسان چڑا اور ایک انسان چڑیا تمہاری زبان میں میاں بی بی رہ گئے۔ اب انہوں نے دانہ بدلی شروع کر دی اور پھر وہی پیار محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ پہلے مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید اُنہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ اس لئے اُڑ کے اور پھڑ پھڑا کے اُن کے قریب میز پر جا بیٹھا، پھر کرسی پر جا بیٹھا۔ وہاں سے اُڑ کر دیوار میں جو تصویر لگی ہوئی تھی اُس کے چوکھٹے پر جا بیٹھا۔ تب بھی اپنے کام سے کام۔ آخر مَیں نے زور سے چلّانا شروع کیا: مَیں یہاں ہوں، مَیں یہاں ہوں۔ چوں چوں، مگر بے حیائی دیکھیے۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔''

سجّاد حیدر یلدرم کا نمائندہ انشائیہ 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' ایک مغربی مضمون کا چربہ ہونے کے باوجود ہماری موجودہ زندگی اور طرزِ معاشرت کا بہترین عکّاس ہے۔ اس میں طنز کی آمد اس قدر فطری اور بے محابا ہے کہ بالکل طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اس انشائیہ میں نہایت دل کش اور خوب صورت پیرائے میں ایسے لوگوں پر طنز کیا ہے جو دوسروں کی مصروفیات، معمولات اور افتادِ طبع کا لحاظ کیے بغیر اپنی سہولت کے مطابق اُن کے معمولات میں دخل انداز ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بظاہر دوست اور ہمدرد ہوتے ہیں اور اپنائیت کا جذبہ بھی پیش کرتے ہیں لیکن اس اپنائیت سے نہ صرف دوست کا نقصان ہوتا ہے اور اُس کے کام میں خلل پڑتا ہے بلکہ اُس کا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اس انشائیہ میں نہایت شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں نفسیاتِ انسانی کی باریکیوں کو کہیں اختصار اور کہیں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بطورِ مثال پیش ہے اُن کے اسی انشائیہ کا یہ اقتباس جس کے ذریعہ اُنہوں نے بے کسی کا رونا رونے والے فقیر سے اپنا موازنہ اس طرح کیا ہے:

> ''مَیں دوستوں کو بُرا نہیں کہتا۔ مَیں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے پاس آتے اور میرے خیر طلب ہیں مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفریں کی جائیں مگر مَیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہ کر سکا کہ احباب کا ایک جمِ غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ مَیں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا چاہے اُس سے میرے دل پر کیسا ہی صدمہ ہو؟

سجّاد حیدر یلدرم نے اپنے ایک مضمون 'حکایتِ لیلیٰ مجنوں' میں لیلیٰ مجنوں کے روایتی عشق کو دورِ جدید کے بدلے ہوئے سماجی ماحول میں پیش کر کے اُس کی ناہمواریوں کو بڑی فن کارانہ مہارت سے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ دوسرے مضامین کی طرح اُن کے اس مضمون میں بھی نشتریت زیادہ نہیں اُبھر سکی ہے بلکہ اُسلوب کی شگفتگی سے ہم آہنگ ہو کر حد درجہ قابلِ برداشت ہے۔ لطیف و شگفتہ اُسلوب اور الفاظ کی نشست و موزونیت کے سبب اُن کی تحریروں میں شاعری کا سا لطف محسوس ہوتا ہے۔ اُنہیں حسّیت و جذباتِ انسانی کی نقاب کشائی میں ملکہ حاصل ہے۔ اُن کے انشائیوں میں فکر کی گہرائی کے ساتھ کہیں ہلکا پھلکا اور بعض جگہ تیکھا طنز محسوس ہوتا ہے جو قاری کو مسکرانے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔

بطورِ مثال پیش ہے اُن کے ایک مضمون 'زیارتِ قاہرہ' کا یہ مختصر اقتباس:

> ''جس قہوہ خانے میں گھس جایئے، جس ٹراموے پر سوار ہو جیے ایک حبشی زادۂ شب رنگ کے پہلو میں ایک تُرک سمن بر بیٹھا ہوا ہے۔ شبِ دیجور اور صبح صادق ایک ہی میز پر کھانا کھا رہی ہیں۔''

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سجّاد حیدر یلدرم کی تحریروں میں طنز و مزاح کی جو چاشنی اور لطیف ظرافت ہے وہ اُن کی ظریفانہ مذاق کی غمّاز بھی ہے اور اُن کی نثر کے اثر کو دو آتشہ بھی کر دیتی ہے۔

08.06 مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ حیدر آباد میں مختلف ملازمتوں پر مامور رہے اور ترقّی کرتے کرتے اسسٹینٹ ہوم سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اُن کا پہلا مضمون آگرہ کے رسالہ ''افادہ'' میں ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ

باقاعدہ مضامین لکھنے لگے۔ وہ اپنی تحریروں کی بوقلمونی، گوناگونی اور شگفتہ اندازِ نگارش کے اعتبار سے ممتاز و منفرد ہیں۔ اُنہوں نے مختلف قسم کے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ اُن کے مضامین مزاحیہ اور سنجیدہ بھی ہیں، تنقیدی اور تاریخی بھی ہیں، سوانحی اور خیالی بھی ہیں۔ اُنہیں حُزنیہ اسلوبِ نگارش میں قدرت حاصل ہے اور وہ فکاہیہ اندازِ بیان پر بھی مہارت رکھتے ہیں لیکن اُن کی مزاحیہ تحریروں کی طرح اُن کے سنجیدہ مضامین مقبول و ہر دل عزیز نہ ہو سکے۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ ''مضامینِ فرحت'' کے نام سے سات جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ 'میری شاعری' کے نام سے اُن کا ایک شعری مجموعہ بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار اُردو کے اہم مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے اُردو مزاح نگاری میں ایک نئی طرح ڈالی جس کے وہ بانی ہیں۔ اُن سے پہلے اس طرز کے نمونے اُردو نثر میں مفقود تھے یا اگر کہیں نظر آتے ہیں تو وہ اتنے شاذ ہیں کہ اُن کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا اُسلوب خوش مذاقی کے باعث نہایت پُر اثر اور مقبولِ خاص و عام ہے۔ وہ واقعہ، کردار یا موازنہ وغیرہ کے ذریعہ قہقہوں کو تحریک دینے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ الفاظ اور جملوں کو نہایت شگفتہ کیفیت میں سمو کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قارئین کے دل و دماغ ایک نفسی انبساط میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر تبسّم مچلنے لگتا ہے اور وہ خود کو تازہ دَم اور بشّاش محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اُن کے بیش تر مضامین اور خاکے خوش مذاقی کے اُسلوب کے بہترین نمونے ہیں جن میں سے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی، پھول والوں کی سیر، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ اور ایک وصیت کی تعمیل'' نہایت اہم ہیں۔ وہ واقعات اور کرداروں کے مقابلے اُسلوب کی شگفتہ کیفیت سے مزاح کو اُبھارنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں بعض مقامات پر واقعہ اور کردار کی موہوم ناہم وَاریوں سے بھی مزاح کو تحریک ملی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی اُن کے یہاں پائی جانے والی ظرافت اُس رنگینی اور خوش مذاقی کے سبب نظر آتی ہے جو مضامین کے تار و پو میں ایک برقی رَو کی طرح دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعض مضامین ظرافت و سنجیدگی کے فن کارانہ امتزاج کے حامل ہیں۔ وہ گزرتے ہوئے واقعات کا تذکرہ زوال پذیر معاشرت اور مٹتی ہوئی تہذیب کے نمونوں کو محفوظ کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ بعض جگہ مضحک پہلو اور بعض جگہ لطائف سے مزاح پیدا کر دینے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔ اُن کی تحریروں میں شوخی و ظرافت کے ساتھ طنز کے نشتروں کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے اُن کی ذہانت، اعلیٰ مزاح، لطیف طنز اور نفسیاتِ انسانی کے رمز شناس ہونے کا ثبوت ہیں۔ وہ اپنے شاہ کار خاکے 'نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی' میں نذیر احمد کی شخصیت کی مرقع کشی اس طرح کرتے ہیں:

> ''رنگ سانولا مگر رُوکھا، قد خاصا اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دَبا دیا تھا، دُہرا بدن گدرایا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے چوں کہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی تُرکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا مگر کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ تو نداس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پلّو اُڑسنے کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے

مگر اُٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اوّل تو قطب سے بیٹھے رہتے تھے اگر اُٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اُٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کو اُڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا، جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ گمگر سفید مقیّش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں جو غُصّہ کے وقت نمودار ہوتی ہے، بلکہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر مَیں ان کو "مُسکراتی ہوئی آنکھیں" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلّہ، جبڑا، بڑا زبردست پایا تھا۔ چوں کہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لئے گنجائش بڑھا دی تھی، اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔"

"پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکّر، مردہ بدست زندہ، غلام، مہینے کی پہلی تاریخ، فرماں بردار بیٹا، میری بیوی، کمسنی کی شادی، اونہہ، کل کا گھوڑا اور صاحب بہادر" کا شمار اُن کے بہترین مضامین میں کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے کی مدد سے مختلف افراد اور مشاہیر کو ڈرامائی انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کردار کی ظریفانہ باتوں اور اپنی شوخی میں حدِ فاصل قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی نذیر احمد کی ظرافت مرزا فرحت اللہ بیگ کی شوخی میں واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ وہ زبان و محاورہ کی شگفتگی سے مزاح پیدا کر کے کسی ماحول یا واقعہ کی ہو بہو تصویر اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ قاری یا سامع زیرِ لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا جیسے وہ اپنے ایک مضمون 'پٹنا' میں اس طرح گویا ہوتے ہیں:

"شریفوں میں اس 'پٹنے' کے اثرات میاں پر اور رزیلوں میں بیوی پر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ ماہرِ لسانیات کی یہ رائے ہے کہ یہ 'حرفِ صوت' ہے اور یہ وہ آواز ہے جو کسی بیوی کی پھُکنی یا دست پناہ کے میاں کی کمر پر پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔"

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مزاح، نکتہ آفرینی، سلیس بول چال، شگفتہ اُسلوبِ نگارش اور دلّی کی با محاورہ زبان کی بدولت اُن کی تحریروں میں جو دل کشی، اثر آفرینی اور ظرافت پائی جاتی ہے وہ انتہائی لطیف اور بلیغ ہے۔

08.07 پطرس بخاری

سیّد احمد شاہ پطرس بخاری کی پیدائش یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور میں ہوئی تھی۔ اُنہیں کتب بینی کا بہت شوق تھا۔ وہ طالبِ علمی کے زمانے ہی سے شعر و ادب میں دل چسپی لینے لگے تھے۔ اُن کا شمار اُردو کے ممتاز بذلہ سنج اور خالص مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ بے حد انتخاب اور اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اُن کی تمام نگارشات کو یکجا کر کے 'پطرس کے مضامین' کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ اُن کے اسی مختصر مجموعہ کی نگارشات کی بدولت اُن کا شمار اُردو کے منفرد اور اعلیٰ درجہ کے مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

پطرس بخاری اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُنہوں نے مزاح نگاری میں قلم اُٹھانے سے قبل کاملانِ فن کی تخلیقات کا بہ غائرِ نظر مطالعہ کیا تھا اور اُن کے متعلّق اپنی بے باک رائے بھی قائم کی تھی۔ یہ رائے کبھی کبھی اس قدر کھری اور بے باک ہوتی تھی کہ اُس میں بالعموم بے دردی اور بے رحمی کا رنگ جھلکنے لگتا تھا۔ نوآموز قلم کار اُنہیں دیکھ کر اپنی تخلیقات اُن سے اس لئے چھپا لیتے تھے کہ کہیں وہ دیکھ نہ لیں اور اُن کی خامیوں کو سب کے سامنے اُجاگر نہ کر دیں۔ ایک مرتبہ امتیاز علی تاجؔ نے بھی ایسا ہی کیا تو پطرس نے اُن سے برجستہ کہا:

''مَیں تمہاری تحریر کو دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں کی تحریروں کے ہم پلّہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ اس میں کوئی خامی باقی نہ رہے۔''

جو قلم کار دوسروں کی تحریر پرکھنے میں اس قدر سخت ہو وہ اپنی نگارشات پر کس قدر اپنا خونِ جگر صرف کرتا ہوگا، اس کا اندازہ پطرس بخاری کی تحریریں پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ پطرس کی تحریروں کا بنیادی وصف فنّی تکمیل ہے۔ اُنہوں نے اُردو مزاح نگاری میں جو منفرد اسلوب و انداز اختیار کیا ہے وہ مزاح نگاری میں ایک نئے دبستان کے سنگ بنیاد کی حیثیت کا حامل ہے۔

پطرس بخاری اور اس اسکول کے علم بردار انگریزی زبان وادب میں مہارت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے انگریزی ادب کی مزاح نگاری کی طرح خالص مزاح کی بنیاد رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ پطرس کے مضامین ہزل، عامیانہ پن اور پھکّڑ پن کے عناصر سے پاک وصاف ہیں۔ اُنہوں نے واقعہ، کردار، موازنہ، مبالغہ، اسٹائل وغیرہ کی مدد سے اپنی مزاح نگاری کو جلا بخشنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ اپنے قارئین کو کبھی ہنسانے اور قہقہہ لگوانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ واقعات کے تسلسل اور کرداروں کی حرکات وسکنات کی فطری طور پر اس طرح عکّاسی کرتے ہیں کہ خود بخود مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔

پطرس بخاری ایک ماہرِ نفسیات کی طرح کردار نگاری اور سیرت طرازی میں مہارت رکھتے ہیں۔ اُن کے تمام کردار فطری انداز میں متحرک نظر آتے ہیں مگر اُنہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ اُن کی حرکتوں کا دوسروں پر کیا اثر پڑ رہا ہے یا دوسرے اُن کے اعمال وحرکات سے کس حد تک متاثر ہو رہے ہیں۔ اُن کے کرداروں کے فطری انداز نے مزاح کو انفرادی اور معیاری رنگ عطا کیا ہے۔ جس میں ہلکے پھلکے طنز کے ساتھ مزاح میں سنجیدگی کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔ پطرس کا لہجہ توازن اور ہم دردی سے مملو ہے۔ اُن کے یہاں نشتریت بالکل مفقود ہے۔ وہ مزاح میں مضمون کی گرفت کے ساتھ اسلوب اور الفاظ کے انتخاب کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور الفاظ کے برمحل استعمال سے زیرِ لب مزاح پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ''کُتّے، مَیں ایک میاں ہوں، مرحوم کی یاد میں، مرید پور کا پیر، میبل اور مَیں، سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی'' اُن کے کامیاب اور بہترین مزاحیہ مضامین ہیں۔ اُنہوں نے اپنے ایک مضمون ''مَیں ایک میاں ہوں'' میں مذاق کے لئے خود کو پیش کیا ہے اور اپنی بے بسی کی عکّاسی ایک ایسے واقعہ سے کی ہے جو مضحکہ خیز بھی ہے اور غیر متوقعہ بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا تو ہُوا کیا؟ آج ہم ہیں تو کل کسی اور کی باری آ جائے گی۔ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اُٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھُلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئیں۔ منہ سے بُرقعہ اُلٹا تو روشن آرا۔''

پطرس بخاری نے ''لاہور کا جغرافیہ اور اُردو کی آخری کتاب'' کے عنوان سے پیروڈی بھی لکھی ہیں جو خاص و عام میں بے حد مقبول ہوئیں۔ وہ آب وہَوا سے متعلّق لکھتے ہیں:

> ''لاہور کی آب وہَوا کے متعلّق طرح طرح کی روایت مشہور ہیں جو تقریباً سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی کچھ آب وہَوا دی جائے لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہَوا کی قلّت تھی۔ اس لئے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اہلِ شہر ہَوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ لاہور میں عام ضروریات کے لئے ہَوا کے بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھویں اور گرد کے مہیا کرنے کے لئے لاکھوں مرکز کھول دیے ہیں۔''

پطرس بخاری نے ''مرید پور کا پیر'' میں واضح کیا ہے کہ تقریر کی صلاحیت یادداشتوں کی شکل میں جیب کے اندر نہیں دماغ کے اندر ہوتی ہے۔ 'مرحوم کی یاد میں' مرزا کے پردے میں ایسے لوگوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو دوستوں کی آڑ میں بھولے بھالے لوگوں کو اپنے دامِ فریب میں پھانس کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ 'سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی' کے ذریعہ جفاکشی کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ 'میبل اور مَیں' سے خلوص اور راست گوئی کا درس دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

پطرس بخاری کے مزاح میں طنز کی نہایت خفیف اور خوش گوار لہریں محسوس ہوتی ہیں۔ خوش طبعی، ظرافت اور ہلکا پھُلکا طنز اُن کے اسلوب کی اہم خصوصیات ہیں۔ اُن کے یہاں ذاتی خوش دلی قوسِ قزح کی طرح نظر آتی ہے۔ اُن کے ذہن کی تیزی وطرّاری اُن کی ہر نگارشات سے عیاں ہے۔ اُن کا ذوقِ مزاح نہایت بلند واعلیٰ ہے۔ وہ مزاح کے رنگ کا گرویدہ ہے جو نشتریت، تخریب، لفظی قلابازیوں اور عملی مذاق سے ملوث نہیں ہوتا بلکہ ذہنی کشادگی اور وسیع القلبی سے تحریک پاتا ہے۔

08.08 رشید احمد صدّیقی

رشید احمد صدّیقی کی ولادت ۱۸۹۶ء میں مڑیّا ہوں ضلع جَون پور میں ہوئی تھی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔ وہ طالب علمی کے زمانہ ہی سے انشاپردازی میں اپنے جوہر دکھانے لگے تھے۔ اُنہیں اُردو طنز ومزاہ کی روایت میں نہ صرف منفرد وممتاز مقام حاصل ہے بلکہ وہ اس میدان میں روایت کی حیثیت بھی اختیار کر چکے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں جس طرح کی بے ساختگی اور برجستگی پائی جاتی اُس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اُن کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی اور لطافت کے ساتھ ساتھ طنز کی تیز دھار بھی نظر آتی ہے۔ دراصل اُنہوں نے طنز ومزاح کو باضابطہ ایک صنف کی حیثیت سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے یہاں طنز ومزاح کے ساتھ سنجیدگی، متانت اور ادبی جاذبیت کا پوری طرح التزام پایا جاتا ہے۔ وہ پھکّڑ پن اور عامیانہ مذاق کو پسند نہیں کرتے۔ اُن کے طنز میں کہیں طعن، تشنیع اور ہزل جیسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اُن کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے۔ اُن کی تحریروں میں جا بجا مخصوص واقعات اور لطیف اشارے پائے جاتے ہیں۔ اُن کی بیش تَر نگارشات معیار ووقار کا بہترین نمونہ ہیں جن سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے تاریخ وسیاسیات وغیرہ سے واقفیت اور ادبی ذوق کا میلان ہونا لازمی ہے۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک فن کے ذریعہ محض افراد کی دل

بستگی کا سامان نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ معاشرے کی ناہم وَاری اور منفی رویّوں کو اُجاگر کر کے معاشرے کی اصلاح کرنے اور صحت مند قدروں کو قائم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔خود رشید احمد صدّیقی لکھتے ہیں:

''طنز وظرافت کسی کی آبروریزی یا اپنی نالائقی کی تسکین کے لئے نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح و اِرتقا کے لئے ہوتی ہے۔''

رشید احمد صدّیقی کا شمار اُردو خاکہ نگاری کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔''گنج ہائے گراں مایہ اور ہم نفسانِ رفتہ'' اُن کی خاکہ نگاری کے شاہ کار ہیں۔''ذاکر صاحب'' بھی اُن کا ایک طویل خاکہ ہے۔''مضامینِ رشید،آشفتہ بیانی میری،شیخ نیازی اور خنداں''میں بھی چند بہترین خاکوں کی شمولیت ہے۔وہ اپنے خاکوں کے آغاز ہی میں ایسے پُرمعنی اور چونکا دینے والے جملے تحریر کرتے ہیں کہ قاری اُنہیں شروع سے آخر تک پڑھنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔بطورِ مثال پیش ہے چند خاکوں کے ابتدائی کلمات:

☆ ولادت تو مادرزاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی مَوت خانہ زاد تھی۔

☆ سیّد نصیرالدّین علوی مرحوم ہنستے کھیلتے زندہ رہے اور ہنستے کھیلتے ہی اُٹھ گئے۔آغاز اور انجام دونوں قابلِ رشک۔

☆ جگرؔ صاحب وہاں پہنچ گئے جہاں ایک نہ ایک دن ہر اُس متنفس کو پہنچنا ہے جو زندگی کے مرض الموت میں گرفتار ہے۔اس دنیا میں مَوت بھی کتنی سستی،یقینی،ہر جگہ،ہر وقت آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہَوا،پانی،آگ اور مٹّی کی طرح یہ بھی ہر جان دار کے لئے کتنی ضروری ہے۔

رشید احمد صدّیقی لفظی بازی گری سے بھی طنز ومزاح پیدا کرتے ہیں اور فلسفیانہ عمل سے بھی۔وہ متضاد فقروں اور اُردو کی تہذیبی اقدار سے بھی اکتساب کرتے ہیں اور اشعار میں حسبِ خواہ تصرّف کر کے عالمانہ،شائستہ اور مہذّب مزاح پیدا کرنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔اُن کے یہاں اچھوتے الفاظ،بیان میں ایجاز واختصار اور اُسلوب میں بے تکلّفی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔وکیل وشاعر،ڈاکٹر ولیڈر،ایڈیٹر ومعلّم غرض سماج کے ہر طبقہ کے افراد پر انہوں نے طنز کے تیر چلاتے ہیں۔اُنہوں نے دیہاتی زندگی کے ایسے گوشوں کو بھی وَا کیا ہے جہاں ہر کس وناکس کی نظر نہیں پہنچتی۔وہ اپنے ایک مضمون''ارہر کا کھیت''میں ارہر کے کھیت کی اہمیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچّوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اُتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکینِ پارلیمنٹ کو،دونوں بولتے ہیں،ضد کرتے ہیں،جھگڑتے ہیں،روتے ہیں اور اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔دیہاتی عورتیں اور بچّے کچھ مفید کام کر جاتے ہیں جن سے اُن کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہندوستانی اراکینِ پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے اُن کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ایک تقاضائے حاجت کرتا ہے اور دوسرے نان کو آپریشن۔''

رشید احمد صدّیقی کے اسلوب اور طنز ومزاح کو اچھّی طرح سمجھنے کے لئے آخر میں اُن کی تحریروں سے چند مختصر اقتباسات درج کیے جارہے ہیں:

☆ جہاں اپنی عقل کام نہ دے وہاں دوسروں کی حماقت سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

☆ کرسمس کا زمانہ تھا۔ جب انگریز کیک اور ہندوستانی سردی کھاتا تھا۔

☆ لیڈروں کے اقسام اور ہندوستان کے امراض کا احاطہ کون کرسکتا ہے۔

☆ امراض کا احساس ہم اُس وقت کرتے ہیں جب ہم اُن میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ بہت سے ایسے جراثیم ہیں جو صرف حقیقتِ منتظر ہیں، لباسِ مجاز میں نہیں آئے ہوئے۔

☆ ہمارے محلّے کے چوکی دار کی آواز ایسی ہوتی ہے گویا چور کو دیکھ کر مارے خوف کے اُس کی چیخ نکل گئی ہے۔

☆ ڈاکٹر نہ ہوں تو مَوت آسان اور زندگی دل چسپ ہو جائے۔

☆ جہاں اپنی عقل کام نہ دے وہاں دوسروں کی حماقت سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

☆ آج کل سب سے آسان بات ثابت کر دینا ہے۔ دس بے وقوف کسی بات پر متّفق ہو جائیں تو وہ بات ثابت ہے۔

☆ تجسس عورت کی فطرت ہے اور پاسبانی اُس کی عادت، اس حقیقت کا سدراہ نہ پردہ ہے نہ پیانو۔

08.09 مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی اُردو کے ایک بلند پایہ مزاح نگار، انشا پرداز اور طنز وظرافت کے رمز شناس ہیں۔ اُن کی نگارشات طنزیہ ومزاحیہ ادب کے سرمایے میں منفرد شان وشناخت کی حامل ہیں۔ اُنہوں نے طنز ومزاح کو نیا لب ولہجہ بھی عطا کیا ہے اور نئی معنویت بھی بخشی ہے۔ وہ نہایت حسّاس فن کار ہیں۔ اُنہیں لفظوں کے فن کارانہ استعمال پر بھی قدرت حاصل ہے اور وہ انسانی نفسیات پر بھی بھرپور گرفت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی حسّاسیت وژرف نگاہی کے عناصر بھی اُن کے مزاج میں پائے جاتے ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جن کی بدولت مشتاق احمد یوسفی نے طنز ومزاح کے فن کو نکھارا بھی ہے اور چمکایا بھی اور اُسے بامِ عروج تک پہنچایا بھی ہے۔ اُن کی نگارشات اُن کی بالغ نظری اور فنّی پختگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ اُن کے طنز میں تندو تلخی اور مزاح میں تازگی وتوانائی نظر آتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کو مغربی ادبیات اور مغربی ماحول ومعاشرے سے بھی بخوبی واقفیت تھی۔ اُن کی تحریروں میں مغربی ادیبوں کی تحریروں کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اُنہوں نے بالخصوص انگریزی مصنّفین رائٹر مارک ٹوئن، سوئفٹ اور اسٹیفین لی سے بھی کسبِ فیض کیا ہے اور اُردو کے مشہور طنز ومزاح نگار رشید احمد صدّیقی اور پطرس بخاری کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ اسی لئے اُن کے یہاں ظرافت وبصیرت اور مزاح ومشاہدہ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اِردگرد کی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اُن کی نگارشات کے بیش تر کردار، اشخاص، واقعات، حادثات، تہذیبی وثقافتی حالات دیکھے بھالے اور جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ وہ روزمرّہ کے واقعات وحادثات اور اپنے تجربات واحساسات کو طنز ومزاح کے پیرایے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حسّیت ودانش وری کے ساتھ رنگارنگی بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ کسی مسئلے کو عقل کی بنیاد پر پرکھتے بھی ہیں اور غور وفکر کے بعد اُس کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف ''چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آبِ گُم ہیں۔ ''چراغ تلے اور خاکم بدہن'' اُن کے انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ ''زرگزشت'' اُن کی سوانح عمری یا اُن کے بینکنگ کیریر کی پُرلطف کہانی ہے۔ اس تصنیف میں متعدد افراد کے دل کش خاکوں

کی بھی شمولیت ہے۔اس میں پیش کیے گئے واقعات لطف اندوز اور سبق آموز بھی ہیں اور عبرت ناک بھی ہیں۔''آبِ گُم'' کے بیش تر کردار ناسٹیلجیا (Nostalgia) یعنی ماضی تمنّائی کے مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔یہ کردار اَنا اور ماضی پرستی کے حصار سے کبھی نکلنا نہیں چاہتے۔

بطورِ نمونہ پیش ہیں اُن کی نگارشات سے چند مختصر اقتباسات :

☆ کہانیاں گڑھتے گڑھتے بشیر چاچا اُنہیں سچ بھی سمجھنے لگا ہے۔بڑھاپے میں مشیخت پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

☆ قبلہ کے امراض کے جراثیم عربی بولتے ہیں۔انگریزی دواؤں کے قابو میں نہیں آتے۔

☆ ایسا ٹھکا ہوا، اتنا پختہ اور اتنا خراب شعر کوئی اُستاد ہی کہہ سکتا ہے۔

☆ رقص کے لباس کے معاملے میں انارکلی کی چھوٹی بہن ثریّا اور بھی اختصار پسند واقع ہوئی تھی۔سینۂ ہمشیر سے باہر ہے دَم ہمشیر کا۔

☆ آدمی ایک دفعہ پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے خواہ بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔

☆ بہت سے شاعر ایسے ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔شاعر مر جاتا ہے مگر کلام باقی رہ جاتا ہے۔اُردو شاعری کو یہی چیز لے ڈوبی۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات سطحیت اور ابتذال سے پاک وصاف ہیں۔اُن کا طنز ومزاح صرف تفریح طبع کا سامان فراہم نہیں کرتا ہے بلکہ تعمیر واصلاح کی طرف متوجّہ بھی کرتا ہے۔اُنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور اختراعی ذہن کی مدد سے طنز و مزاح کے فن کو وسعت بھی بخشی ہے اور طنز ومزاح کے لئے نئی راہ بھی ہموار کی ہے۔

08.10 خلاصہ

اُردو میں طنزیہ ومزاحیہ تخلیق کار کی حیثیت سے متعدد نام وَر قلم کاروں نے طنز ومزاح کی روایت میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے جن میں سے رتن ناتھ سرشار، اکبرالہ آبادی، سجّاد حیدر یلدرم، مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدّیقی اور مشتاق احمد یوسفی نہایت منفرد اور ممتاز طنز ومزاح نگار ہیں۔رتن ناتھ سرشار کے یہاں طنز کی فراوانی نہیں ہے۔اُن کے اسلوبِ نگارش میں مزاح کے متعدد رنگ جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اُن کا شگفتہ اندازِ بیان اُن کی تحریروں کو دل نشیں اور اثر انگیزی سے لبریز رکھتا ہے۔اکبرالہ آبادی رعایتِ لفظی، تصرّف، تحریف، محاورہ اور انگریزی زبان کے الفاظ کی آمیزش سے جدّت وظرافت پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔اُنہوں نے سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور شخصی زندگی کے بہت سے مکروہ پہلوؤں اور ناگوار گوشوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے مگر اُن کے طنز ومزاح کا اصل نشانہ مغربی طرزِ معاشرت ہے۔

سجّاد حیدر یلدرم کا مزاج نہایت لطیف اور سُلجھا ہوا ہے۔زبان وبیان پر عبور حاصل ہونے اور ترکی کے رومانی ادب سے واقفیت ہونے کے باعث اُن کی تحریروں میں دل کشی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔وہ نہ تو ہنسوڑ ہیں نہ مضحکہ خیز بات کرتے ہیں اور نہ بات بات سے لطیفے پیدا کرنے کے قائل ہیں۔اس کے برعکس وہ مسکراہٹ، ہلکی ہنسی اور تبسّمِ زیرِ لب کو ترجیح دیتے ہیں۔مرزا فرحت اللہ بیگ کا اسلوب خوش مذاقی کے باعث نہایت پُر اثر اور مقبولِ خاص وعام ہے۔وہ واقعہ، کردار یا موازنہ وغیر کے ذریعہ قہقہوں کو تحریک دینے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ الفاظ اور جملوں کو نہایت شگفتہ کیفیت میں سمو کر پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔پطرس بخاری کا ذوقِ مزاح نہایت بلند واعلیٰ ہے۔وہ مزاح کے رنگ کا گرویدہ ہے جو نشتریت، تخریب، لفظی قلابازیوں اور عملی مذاق سے ملوث نہیں ہوتا بلکہ ذہنی کشادگی اور وسیع القلبی سے تحریک پاتا ہے۔

رشید احمد صدّیقی کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی اور لطافت کے ساتھ ساتھ طنز کی تیز دھار بھی نظر آتی ہے۔ دراصل اُنہوں نے طنز و مزاح کو باضابطہ ایک صنف کی حیثیت سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے یہاں طنز و مزاح کے ساتھ سنجیدگی، متانت اور ادبی جاذبیت کا پوری طرح التزام پایا جاتا ہے۔ وہ پھکّڑ پن اور عامیانہ مذاق کو پسند نہیں کرتے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نگارشات سطحیت اور ابتذال سے پاک وصاف ہیں۔ اُن کا طنز و مزاح صرف تفریحِ طبع کا سامان فراہم نہیں کرتا ہے بلکہ تعمیر و اصلاح کی طرف متوجّہ بھی کرتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور اختراعی ذہن کی مدد سے طنز و مزاح کے فن کو وسعت بھی بخشی ہے اور طنز و مزاح کے لئے نئی راہ بھی ہم وَار کی ہے۔

08.11 فرہنگ

آبروریزی : بےعزّتی، ذلّت
آؤ دیکھا نہ تاؤ : بغیر سمجھے بوجھے، کچھ سوچے بغیر، ایک دَم سے
اپنے کام سے کام : اپنے مطلب سے مطلب، اپنی غرض سے غرض
اور : دیگر، دوسرے
اولڈ : عمر دراز، ضعیف (Old)
اونچی آواز : بلند آواز، تیز آواز
اُٹھ جانا : مرجانا، انتقال کر جانا
اِحاطہ کرنا : حدود قائم کرنا، گھیرنا
اُڑسنا : کھونسنا، اٹکانا، کسی چیز کو کسی چیز میں اُڑس دینا
اکڑنا : شیخی کرنا، گھمنڈ دکھانا
اَسمبلی : مجلسِ شوریٰ، مجلسِ قانون ساز، (Assembly)
امراض : مرض کی جمع، بیماریاں
اوجھل ہونا : نظر سے غائب ہو جانا
بی بی : بیوی، زوجہ
بھُٹّا سا اُڑا دینا : ایک ہی ضرب میں کاٹ ڈالنا
پارلیمنٹ : کسی ملک کی سب سے بڑی مجلسِ قانون ساز
پیانو : ہارمونیم کی وضع کا ایک مغربی باجہ، (Piano)
تُرکی ٹوپی : ایک قسم کی ٹوپی جو گول اور کچھ لمبی ہوتی ہے جس کی اوپری سطح کے بیچ میں پھُندنا لگا ہوتا ہے
سانولا : سانولے رنگ کا، سیاہی مائل، ملیح، سبزہ رنگ آدمی
سایہ افگن : سایہ کرنے یا ڈالنے والا، حفاظت یا مدد کرنے والا
سٹکنا : چلا جانا، روانہ ہونا
سدِ راہ ہونا : روک بننا، مانع ہونا، حائل ہونا
سِدھارنا : روانہ ہونا، جانا
سر : انگریزی سرکار کا ایک خطاب جو اہم شخصیات کو عطا کیا جاتا تھا
سمن بر : چنبیلی سا بدن والا، خوب صورت، معشوق
سونے کی چڑیا : قیمتی چیز
شبِ دیجور : اندھیری رات، نہایت تاریک رات
عقل پر پردہ پڑ جانا : سمجھ جاتی رہنا، سوچنے سمجھنے کی تمیز باقی نہ رہنا
قہوہ خانہ : وہ دُکان یا ہوٹل جہاں لوگ کافی یا چائے پیتے ہیں
کرسمس : عیسائیوں کا بڑا دن، حضرتِ عیسیٰ کی ولادت کا دن، (Christmas)
کفایت شعاری : کم خرچی، جُزرسی
کگر : کگار، کنارہ، حاشیہ

تکملہ کرنا : مکمّل کرنا، پورا کرنا

تقاضائے حاجت : ضرورت کی چیز طلب کرنا، ضروری چیزوں کی کرنا : مانگ کرنا

ٹھُکا ہُوا : درست، فصیح و بلیغ

ثابت کرنا : ثبوت دینا، دلائل یا تحقیق سے یقین دلانا

ٹھنگنا : پستہ قد، چھوٹے قد کا، بَونا، ناٹا

جبڑا : دہن کی ہڈّی کا وہ حصّہ جس میں دانت جڑے ہوتے ہیں، کلّہ

جراثیم : نہایت چھوٹے چھوٹے کیڑے

چمکنا : نمایاں ہونا، جدید طرزِ معاشرت اختیار کرنا

چوڑان : چوڑائی، وسعت، کشادگی

چوکھٹا : تصویر کا فریم

خندہ پیشانی : خوش مزاجی، خوش دِلی، شگفتہ مزاجی

خیر طلب : خیر خواہ، بہی خواہ، خیر اندیش، بھلائی چاہنے والا

دانہ بدلی : پرندوں کا ایک دوسرے کو دانہ کھلانا، باہم اختلاط

دخل ہونا : رسائی ہونا، باریابی ہونا

دست پناہ : چمٹا، آگ پکڑنے کا آلہ

دہانہ : مُنہ، دہن

ڈِنر : رات کا کھانا، عشائیہ (Dinner)

راستہ لینا : روانہ ہونا، چل دینا

رہا نہ جانا : برداشت نہ کرسکنا، ضبط نہ ہونا

رہے سہے : باقی، بچے ہوئے

زبردست : قوی، طاقتور، مضبوط

زمین میں گڑ جانا : نہایت شرمندہ ہوجانا، بہت نادم ہوجانا

سانس کھینچنا : گہری سانس لینا، لمبی سانس لینا

کلّہ : سر، کھوپڑی، کلّا

کوٹ کوٹ کر : حد درجہ ہونا، بہت زیادہ ہونا، کثرت سے بھری ہونا : ہونا

گدرانا : نیم پختہ ہونا، جوانی کا آغاز ہونا

گل گشت : باغ کی سیر، سیرِ چمن

لمبان : لمبائی، طول

لے ڈوبنا : اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ڈبو دینا۔ اپنے ساتھ دوسروں کا بھی نقصان کرنا

مبتلا ہونا : پھنس جانا، گھِر جانا

مُتنفِس : سانس لینے والا، جان دار، انسان

مُرمُروں کا تھیلا : موٹا یا فربہ آدمی، ایسا شخص جس کے جسم کی ہیئت مُرمُروں کے تھیلے جیسی ہو

مشیخت : غرور، گھمنڈ

مفادِ عامہ : عوام کا فائدہ، عوام کی بہتری

مفت میں : بے وجہ، بے سبب

مُقیّش : سونے چاندی کے تار

ملتوی کرنا : التوا میں ڈالنا، کچھ وقت کے لئے ٹال دینا

میاں : شوہر، خاوند

نان کوآپریشن : عدمِ تعاون

نفریں کرنا : لعنت کرنا، ملامت کرنا

ہتّھا مارنا : ہاتھ صاف کرنا، کھانا

ہم پلّہ : برابر کی ٹکّر کا، ہم رُتبہ

ہندی : ہندوستان کا رہنے والا، ہندوستان کا باشندہ

ہنستے کھیلتے : خوش وخرّم، خوش دِلی سے

ینگ : جوان (Young)

08.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ رشید احمد صدّیقی کے اسلوب نگارش کا تجزیہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ ''فسانۂ آزاد'' کی اہم خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۳ پطرس بخاری کے مزاح کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ مرزا فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ اکبرالہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ مشتاق احمد یوسفی کے طنز ومزاح پر تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : رتن ناتھ سرشار کی سب سے اہم اور شہرہ آفاق کتاب کا نام کیا ہے؟

(الف) سیرِ کہسار (ب) پی کہاں (ج) فسانۂ آزاد (د) جامِ سرشار

سوال نمبر۲ : اکبرالہ آبادی کو کس خطاب سے نوازا گیا تھا؟

(الف) خان بہادر (ب) طوطیِ ہند (ج) ابوالاثر (د) خدائے سخن

سوال نمبر۳ : درج ذیل میں سے کون سی کتاب مشتاق احمد یوسفی کی نہیں ہے؟

(الف) آبِ گُم (ب) خدائی فوجدار (ج) زرگزشت (د) چراغ تلے

سوال نمبر۴ : درج ذیل میں سے کون ادیب 'ادبِ لطیف' کا نمائندہ قلم کار ہے؟

(الف) رتن ناتھ سرشار (ب) مرزا فرحت اللہ بیگ (ج) مشتاق احمد یوسفی (د) سجّاد حیدر یلدرم

سوال نمبر۵ : ''نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' کس کی تخلیق ہے؟

(الف) مرزا فرحت اللہ بیگ (ب) رشید احمد صدیقی (ج) پطرس بخاری (د) اکبرالہ آبادی

سوال نمبر۶ : مرزا فرحت اللہ بیگ کا مجموعہ ''مضامینِ فرحت'' کتنی جلدوں میں شائع ہوا ہے؟

(الف) دو (ب) پانچ (ج) چار (د) سات

سوال نمبر۷ : لیلیٰ مجنوں کے روایتی عشق کو دورِ جدید کے بدلے ہوئے سماجی ماحول میں کس نے پیش کیا ہے؟

(الف) سجّاد حیدر یلدرم (ب) مشتاق احمد یوسفی (ج) اکبرالہ آبادی (د) رتن ناتھ سرشار

سوال نمبر۸ : درج ذیل میں سے کون سا مضمون رشید احمد صدّیقی کا ہے؟

(الف) کُتّے (ب) خنداں (ج) لاہور کا جغرافیہ (د) سویرے جو کل آنکھ میری کھُلی

سوال نمبر۹ : مندرجہ ذیل قول کس کا قول ہے؟

''طنز وظرافت کسی کی آبروریزی یا اپنی نالائقی کی تسکین کے لئے نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح و اِرتقا کے لئے ہوتی ہے۔''

(الف) پطرس بخاری (ب) مشتاق احمد یوسفی (ج) سجّاد حیدر یلدرم (د) رشید احمد صدّیقی

سوال نمبر۱۰ : درج ذیل میں سے ''خوجی'' کس تصنیف کا کردار ہے؟

(الف) خیالستان (ب) فسانۂ آزاد (ج) شیخ نیازی (د) خاکم بدہن

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ج) فسانۂ آزاد	جواب نمبر۶	: (د) سات
جواب نمبر۲	: (الف) خان بہادر	جواب نمبر۷	: (الف) سجّاد حیدر یلدرم
جواب نمبر۳	: (ب) خدائی فوجدار	جواب نمبر۸	: (ب) خنداں
جواب نمبر۴	: (د) سجّاد حیدر یلدرم	جواب نمبر۹	: (د) رشید احمد صدّیقی
جواب نمبر۵	: (الف) مرزا فرحت اللہ بیگ	جواب نمبر۱۰	: (ب) فسانۂ آزاد

08.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا

۲۔ اُردو نثر کا فنّی اِرتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۳۔ طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ از خواجہ عبدالغفور

۴۔ فرہنگ فسانۂ آزاد اور اُس کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ از ڈاکٹر شریف احمد قریشی

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar
Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232
www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in
Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

MAUL - 604-1(004133)